اقبال

اور

نظریۂ خودی

ستیار محمد سید قادری

0168.1M77:g
N1

اقبال

اور

نظریۂ خودی

GHALIB ACADEMY
NEW DELHI

سید محمد سعید قادری

اقبال اور نظریۂ خودی

IQBAL AUR NAZRIYA KHUDI

Acc.No. 8427

پبلشرز :-

گلشن پبلیشرز، گاؤکدل چوک سرینگر

GULSHAN PUBLISHERS GAWKADAL CHOWK
SRINAGAR

O168,1M77:g
N1

GHALIB ACADEMY
NEW DELHI

تقسیم کار :-

شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجران کتب گاؤکدل

SHIEKH MOHAMMAD USMAN AND SONS
BOOKSELLERS AND STATIONERS GAWKADAL, SGR.

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

نام کتاب _____ اقبال اور نظریۂ خودی

مصنف _____ سیار محمد سید قادری

کتابت _____ منظور قادری، نوہٹہ

طباعت _____ خواجہ پریس دھلی

صفحات _____ ۱۲۰

قیمت _____ ۳۵ روپے

بار اول _____ سنہ ۱۹۹۱ء

گلشن پبلیشرز گاؤکدل چوک سرینگر

فہرست مضامین

(باب اوّل)

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	انتساب	۶
۲	پیش گفتار	۷
۳	ادب کے طبقے	۹
۴	درِّ ثمین	۱۰
۵	پیش لفظ	۱۱
۶	تقریظ	۱۵
۷	تعارف حیات اقبال	۱۶
۸	قوت جمیل	۲۳
۹	زندگی کے مدّ و جزر	۲۴
۱۰	انسان اوّل	۲۷
۱۱	ابتداء نہیں، انتہا کیا ہے؟	۲۹
۱۲	خلافت اور تحقیق لفظ خلیفہ	۳۱
۱۳	مردِ مؤمن	۳۳
۱۴	پہچان	۳۴

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۴	دو نکتے	۳۷
۱۵	ایک روایت	۳۹
۱۶	نفس اور آفاق کی پہچان	۴۰
۱۷	انسان اور حیوان	۴۳
۱۸	رُوح کیا ہے؟	۴۷
۱۹	مقامِ خودی	۵۰
۲۰	درِّ ثمین	۵۶
	(باب دوم)	
۲۱	عشقِ حقیقی	۵۸
۲۲	لہلہاتے گلستان کا مہکتا پھول	۶۰
۲۳	عشق کیا ہے؟	۶۲
۲۴	اقبال، ایک عاشقِ رسولؐ	۶۶
۲۵	والدین کی تربیت کا نتیجہ	۷۳
۲۶	قرآن مجید کے ساتھ شغف	۷۶
۲۷	عظمتِ قرآن اور علامہ	۷۹
۲۸	اعترافِ تربیت والدین	۸۱
۲۹	حضورؐ کا صدقہ	۸۳

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
۸۵	اقبال حضورؐ کے حضور میں	۳۰
۸۷	اقبال صرف شاعر ہی نہیں	۳۱
۸۹	اقبال کی شاعرانہ زندگی کے ادوار	۳۲
۹۳	تحقیق لفظ خودی اور اسکا مفہوم	۳۳
۹۵	خودی اور خدا کا تعلق	۳۴
۹۹	خودشناسی خداشناسی	۳۵
۱۰۱	رُوح زندہ ہے	۳۶
۱۰۳	خودی کا تعلق عشق اور زندگی سے	۳۷
۱۰۵	منصور اور تصوّر عشق و خودی	۳۸
۱۰۸	اقبال اور تصوّف	۳۹
۱۱۶	تقدیر یزداں	۴۰
۱۱۹	درثمین	۴۱

مجھے یاد ہے جب آپ نے مجھ سے فرمایا کہ "بیٹا! دولت سے نام کما نا کمال نہیں، غریبی میں نام پیدا کر۔ یہاں کی دولت یہاں ہی رہتی ہے، وہاں کی دولت حاصل ہو تو کچھ بات ہے۔"

ایک دفعہ پھر آپ نے فرمایا۔ "بیٹا! حضور سرورِ کائناتؐ کے ساتھ ظاہری اور باطنی دونوں طرح کا رشتہ عہدِ شباب میں ہی پیدا کر۔ یہ تمہاری روشن مستقبل کا ضامن ہے۔ قرآن حکیم سے شغف رکھ۔ یہی تمہارے لئے دلیل اور حجت ہے۔"

اللہ تعالیٰ سے میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی آخری آرامگاہ کو اپنی بے پایاں رحمت سے منور فرما کر اپنے اور آقائے نامدار شفیع المذنبینؐ کے دیدار سے مشرف کر کے جنت الفردوس اور جنت المأوٰی میں جگہ دے۔

آمین ثم آمین

ابن غلام محمد شاہ قادری

اوڑورہ

پیش گفتار

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے فکر و ذہن کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا باقی رہ گیا ہوگا جس پر ماہرین اقبالیات نے قلم نہ اُٹھایا ہو۔ قریب قریب چھوٹی بڑی دو ہزار کتابیں علامہ پہ لکھی جا چکی ہیں۔ چنانچہ اردو شعراء میں یہ انکی خوش اقبالی کا ایک جیتا جاگتا اور زندہ و پائندہ ثبوت ہے۔ میرے خیال میں اقبال اردو کا وہ واحد شاعر ہے جس کے سینکڑوں اشعار لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں اور جن کے نام سے عربی اور فارسی بولنے والے تمام ممالک متعارف ہیں۔ علامہ نے شاعری کے لئے مقصدیت ایک اہم عنصر قرار دیا ہے۔ اور یہ خیال ان لوگوں پر کاری ضرب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو شاعری کو بے لگام اور بے مقصد دیکھنا چاہتے ہیں۔

؎ شاعرِ دلنواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری
شانِ خلیلؑ ہوتی ہے اسکے کلام سے عیاں
کرتی ہے اسکی قوم جب اپنا شعار آذری

زیرِ نظر کتاب "نظریہ خودی اور علامہ اقبال" میرے دوست سید محمد سید قادری کی یہ دوسری ادبی کوشش ہے اور اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے محسوس ہوا کہ سید صاحب کو علامہ کے کلام اور حیات

آفرین پیغام سے زبردست دلچسپی ہے۔ سید صاحب خالصتاً عربی زبان کے طالب علم ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر مقامات پر عربی اصطلاحات کا بکثرت استعمال ہوا ہے اور قرآنی آیات اور احادیث پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے جابجا استنباط کیا ہے۔ سید صاحب نے اقبال کے نظریۂ خودی کو اس محور کے اردگرد لانے کی بے پناہ کوشش کی ہے۔ جیسے قرآن احسنِ تقویم خلیفۃ اللہ وغیرہ سے موسوم کرتا ہے۔ کتاب میں اچھے اور نپے تُلے خیالات کا انبار جمع ہے تاہم زبان و بیان میں کہیں کہیں اونچ نیچ، ڈھیلاپن اور لفظی اسقام نظر آتے ہیں۔ جس کی طرف آئندہ سید صاحب کو توجہ کرنی چاہیئے۔

خُدا کرے کہ یہ کتاب قبولِ عام حاصل کرے اور اقبالؒ کے انقلابی نظریات، بُلند خیالات اور خاص طور پر اُنکے عشقِ سرورِ کائنات صلعم کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو۔ وَالسّلَام عَلٰی مَن اتبَعَ الھُدٰی۔

ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

(شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی)

۲۲ر دسمبر ۱۹۸۹ء

ادب کے طبقے

شیخ ابو نصر سراج رضؒ فرماتے ہیں کہ لوگوں میں ادب کے تین طبقے ہیں۔

۱۔ دنیا والوں کا طبقہ :

ان کا ادب زیادہ سے زیادہ فصاحت و بلاغت اور علوم سیکھنے، اُمراء و بادشاہوں کے قصص و حکایات بیان کرنے اور اشعارِ عرب پڑھنے پر مشتمل ہوتا۔

۲۔ دینداروں کا طبقہ :

ان کا ادب زیادہ سے زیادہ ریاضت نفس، اپنے کل اعضاء کو ادب سے رکھنے، حدودِ شرعیہ کے خیال رکھنے نیز شہوات کے ترک کرنے پر مشتمل ہوتا ہے۔

۳ خواص کا طبقہ :

ان کا ادب طہارتِ قلب، اسرار کی رعایت، وفائے عہد و صداقت کی نگہداشت، خطرات کی طرف التفات نہ کرنے، مقاماتِ طلب، اوقات حضور، مقامات قرب اور ان سب میں ادب کی رعایت ملحوظ رکھنے پر مشتمل ہے۔

(ابن غلام محمد شاہ قادری)

یہاں کی دولت یہاں ہی رہتی ہے وہاں کی دولت حاصل ہو تو کچھ بات ہے۔

(ابو السید غلام محمد شاہ قادریؒ)

دُرِّ ثمین

ایک دفعہ حضرت رابعہ بصریؒ نے حضرت حسنِ بصریؒ کو بطور ہدیہ موم، سوئی اور بال بھیجا۔

موم اس لئے کہ جسطرح موم اپنے آپ کو جلاکر لوگوں کو روشنی دیتی ہے اسی طرح اپنے آپ کو تم بھی جلاؤ اور لوگوں کو روشنی دو

سوئی اس لئے کہ جسطرح سوئی برہنہ رہتی ہے اور لوگوں کے کام نکالتی ہے اسی طرح تم بھی برہنہ رہ کر لوگوں کے کام نکالو۔

بال اس لئے کہ جب تم مثل موم اور سوئی کے خلق کو فائدہ پہنچاؤ گے تو پھر مثل بال کے ہو جاؤ گے کہ کبھی تمہارا کام نہ بگڑے گا۔

(رابعۂ بصریؒ)

گواہ بن لیکن پہلے ایمان کی پختگی حاصل کر

(ابوالسیدؒ غلام محمد شاہ قادری)

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلَی الذَّاتِ عَظِیْمِ الصِّفَاتِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ۔ اَمَّا بَعْدُ

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں

اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

(اقبال)

بندہ کشمیر کے اس علاقے کا باشندہ ہے جسے جدید تحقیق کے مطابق اقبال کا آبائی علاقہ کہا جاتا ہے۔ جس خاکِ ارجمند نے علامہ کے آباء واجداد کو جنم دیکر اپنی بے مثال آب وہوا سے نشوونما فرمائی۔ آج وہی سرزمین اور اس کی آب وہوا اپنی خاموش زبان سے علامہ کو یاد کرتی ہے۔ اور اپنی ساحرانہ کشش سے علامہ کے عاشقوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ چند سال گذرے کہ کشمیر کلچرل اکیڈیمی کے اربابِ اختیار نے یہاں آکر کچھ نشاندہی بھی کی۔

مدت سے بندۂ ناچیز کی یہ آرزو رہی ہے کہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال سے متعلق کچھ خاص باتیں صفحۂ قرطاس پر لاکر اُنکی خدمت میں اپنا نذرانہ عقیدت پیش کروں۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر ہے کہ جس نے مجھ جیسے سرتاپا معصیت میں ڈوبے ہوئے بندہ کو گوناگوں مشکلات کے باوجود

علامہؒ کے "نظریہ خودی" پر اس کتابچہ کو جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے تحریر کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ علامہؒ کی زندگی کا لگ بھگ کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر محققین نے اپنی علمی بساط کے مطابق قلم فرسائی نہ کی ہو۔ لیکن تشنہ کام ہنوز تشنہ لب ہے۔ یہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ علامہؒ کی زندگی کا ہر گوشہ تابدار رہا ہے۔ اُن کی زندگی کے کسی بھی پہلو کی خواہ جس قدر بھی تشریح و توضیح کی جائے پھر بھی ناتمامی کا احساس باقی رہتا ہے۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اُس وقت علامہ اقبالؒ اپنے دل میں جذبات اور علم کا ایک ابلتا ہوا سمندر لئے ہوئے تھے۔ اسی بحر زخار کے لئے جب اردو زبان کا دامن تنگ پڑا تو علامہؒ نے فارسی زبان کا سہارا لیا اور ایسے ایسے گہر ریزوں کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جن کو دیکھکر لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ کیونکہ یہ گہر ریزے بالکل نئے اور انوکھے تھے اور ان کو یورپ اور ایشیا کے کسی شاعر نے چھوا تک نہیں۔ علامہ نے "اسرار خودی" لکھ کر انسان کو اس کی اصلی حیثیت سے آگاہ کر کے اس کو اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی دعوت دی۔ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ اگلے زمانے کے بہت سے شعراء نے خودی مٹانے کا درس دیا ہے۔ اس فکر کے علمبردار اولاً یونانی شعراء رہے ہیں۔ یونانی ادب کا ترجمہ جب مسلمانوں نے عربی زبان میں کیا تو یہ فکر مسلمانوں کے ایک قابل لحاظ طبقے کے اندر پیوست ہو گئی۔ اس فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو ہاتھ

پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں بلکہ اسے توکل علی اللہ کر کے گوشہ نشینی کی زندگی کو اختیار کر لینا چاہیئے۔ اور ابدی زندگی کے حصول کے لئے اپنے آپ کو فنا کر ڈالنا چاہیئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان کاہلی و سستی اور بے عملی جیسے مہلک امراض میں مبتلا ہو گئے۔ علامہ نے اس خرابی کو بہ نفسِ نفیس محسوس کیا اور پھر "اسرار خودی" میں اس سے بچنے کی پُرزور تلقین کی۔

بالفاظ دیگر علامہ اقبال نے خودی کا درس دیکر انسان کو خواب غفلت سے بیدار کیا ہے اور انسان کو بحیثیت انسان زندہ رہنا سکھایا ہے۔ اور بتلایا ہے کہ انسان وہی ہے جو اپنے آپ کو پہچانے۔ دُنیا میں جو کچھ بھی ہے سب انسان کے خاطر ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے دل سے سارے توہمات، خوف و ڈر کو کلّی طور پر نکال دے۔ دریاؤں میں کود پڑنے، لہروں سے لڑے، چٹانوں سے ٹکرا جائے۔ کیونکہ زندگی میدانِ خارزار ہے۔ پھولوں کی سیج نہیں۔ خیالات اور جذبات کے اسی سیلاب میں علامہ ہمیں ہدایت دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اُخوّت کا بیاں ہو جا، محبّت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندہ ساحل اُچھل کر بیکراں ہو جا

پھر آگے فرماتے ہیں:

خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سرّ زندگانی ہے
نکل کر حلقہ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

یہاں پر "خودی" کو علامہ نے زندگی کا راز قرار دیا ہے۔ اسی

خودی کے موضوع پر اب یہ کتابچہ " اقبال اور نظریہ خُودی" موسوم بہ "الیٰ سَبیلِ الرَّشَاد" کے نام سے آپ کے سامنے شرفِ قبولیت کی خاطر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہاں میں نے بکھرے ہوئے چند قیمتی موتیوں کو ایک ہی مالا میں پرونے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اُمید کرتا ہوں کہ میری یہ سعی عندالنّاس مفید اور عنداللہ باعث نجات ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ میری یہ کوشش قبول فرماکر میرے والدین کو دین و دُنیا کی بہتری عطا کرے اور اُن کو جنت الفردوس کا وارث بنائے۔

بالخصوص میں اپنے استاذی المکرم واجب الاکرام محترم المقام جناب ڈاکٹر محمد اسلم اصلاحی صاحب کا بہت ہی مشکور ہوں جنھوں نے گوناگوں مصروفیات کے باوجود میری اس ناچیز سعی کو دیکھا اور اس کی تصحیح فرماکر مجھے ممنون فرمایا۔

آخر پر میں اُن سارے رُفقاء کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے اس کتابچہ کی تصنیف میں دامے، درمے، سخنے، قدمے میری مدد کی اور اپنے نیک مشوروں سے وقتاً فوقتاً نوازا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو خیر دارین عطا کرے۔ آمین

خادم قوم و ملّت

اَبُو المُدَثِّر سیّار مُحمّد سیّد قادری

اوڑورہ، کولگام

تقریظ

دنیا کے عظیم شعراء میں جن کو تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے تحمید و ثنا کے گلدستہا مل چکے ہیں، میں سے اقبالؒ کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم کے بقول علامہ کی خدمات پر کم و بیش دو ہزار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ یہ تعداد ان چھوٹے چھوٹے رسالوں اور مقالوں کے علاوہ ہے جنھیں مختلف ادباء و شعراء نے متنوع جلسوں میں پیش کیا ہے۔ علامہ ایک انقلاب تھے، ایک عظیم شخصیت تھے۔ جنھوں نے ادباء کی محفلوں میں ہلچل پیدا کر دی، انکے نظریہ خودی نے عالمی شہرت حاصل کر لی ہے۔

میرے دوست سید صاحب نے اسی خاص نظریہ کو گہرے سوچ و فکر کے ساتھ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، ایسے نوجوان تحمید کے قابل ہیں جن کے دلوں میں اقبال کی شخصیت پیوست ہو گئی ہے اور ان کے مختلف گوشوں کو ظاہر کرنے کے گرویدہ ہیں۔

اُمید ہے کہ شائقین اور اقبالیات سے شغف رکھنے والے حضرات مؤلف کی ہمت افزائی کریں گے اور نیک مشوروں سے نوازیں گے اور اس عظیم کام میں ہاتھ بٹائیں گے۔

مرزا ناصر بیدار
ڈیپارٹمنٹ آف ماس کمیونیکیشن
یونیورسٹی آف کشمیر

تعارفِ حیاتِ اقبالؒ

سرزمین کشمیر کو جہاں یہ فخر حاصل ہے کہ یہ دُنیا بھر میں اپنے بے مثل قدرتی مناظر اور رعنائیوں کی وجہ سے مشہور و معروف ہے۔ وہاں رشیوں، منیوں، ولیوں، بزرگوں، عالموں، صوفیوں اور شاعروں کے وجود سے یہ خوبصورت قطعہ ارضی باعث صد رشک و افتخار رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس سرزمین نے بڑے بڑے بزرگوں، عالموں اور شاعروں کو جنم دیا ہے۔ اگرچہ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ سرزمین سیالکوٹ میں تولد ہوئے۔ لیکن یہ بات فراموش نہیں کی جانی چاہیئے کہ ان کی اصل کا تعلق سرزمین کشمیر سے ہی ہے۔ اُن کے بزرگوں نے اسی سرزمین میں جنم لیا تھا اور پھر یہاں سے نقل مکانی کر کے سیالکوٹ کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ اُن کے آباء و اجداد کشمیری برہمن تھے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پندرھویں صدی عیسوی میں اور جدید تحقیقات کے مطابق سترھویں صدی عیسوی میں علامہ کا یہ خاندان مشرف بہ اسلام ہوگیا تھا۔ علامہ اقبالؒ خود اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام ضرب کلیم میں اس طرح فرماتے ہیں۔

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا　　زناری برگساں نہ ہوتا
میں اصل کا خاص سومناتی　　آباء میرے لاتی ومناتی
تو سیّد ہاشمی کی اولاد　　میری کفِ خاک برہمن زاد

سپرگوت کے برہمن آج سے ڈھائی سو سال قبل مسلمان ہو گئے تھے۔
ڈاکٹر اقبالؒ بھی اسی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ یہ خاندان کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آباد ہو گیا تھا۔ اقبال کے جدّ اعلیٰ لولی حاجی تھے۔ جو علمدار کشمیر شیخ نُورالدّین نُورانیؒ کے مشہور خلیفہ حضرت بابا نصرُالدّینؒ کے مُرید خاص تھے۔ اُنھوں نے کئی حج کئے تھے اور لگ بھگ بارہ سال تک بیرونِ کشمیر زندگی گذاری تھی۔ لولی حاجی کا آبائی گاؤں تحصیل کولگام (پرگنہ اڈون) چکوہ تھا۔ لولی حاجی کے بعد علّامہ کے جدّ اعلیٰ شیخ جمال الدّین تھے۔
کئی لوگوں کی رائے ہے کہ غالباً شیخ جمال الدّین ہی سترھویں صدی عیسوی میں کشمیر سے نقل مکانی کر کے سیالکوٹ میں جا بسے۔ شیخ جمال الدّین کے بیٹے کا نام شیخ رفیق تھا۔ شیخ رفیق کے فرزندوں کی تعداد کے بارے میں نہ معلوم کیوں دو جدید محققین جگن ناتھ آزاد اور محمّد یُوسف ٹینگ کے مابین اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں کہ شیخ محمّد رفیق کے تین فرزند تھے۔ شیخ نور محمّد، شیخ غلام قادر اور شیخ محمّد۔
محمّد یُوسف ٹینگ لکھتے ہیں کہ شیخ رفیق کے صرف دو بیٹے شیخ نُور محمّد اور شیخ غلام محمّد تھے۔ بہرحال دونوں محققین کے نزدیک یہ بات مسلّم ہے کہ علّامہ کے والد محترم شیخ نُور محمّد، شیخ رفیق کے فرزند تھے۔
کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ہی اس خاندان نے سیالکوٹ کی طرف ہجرت کی تھی۔

(اقبال نامہ۔ کلچرل اکیڈیمی)

"اقبال دروں خانہ" کے مصنف خالد نظیر صوفی کا بیان ہے کہ علامہ اقبالؒ سیالکوٹ میں ۲۹ دسمبر ۱۸۷۴ء میں تولد ہوئے۔ صوفی صاحب کا یہ بیان سیالکوٹ میونسپلٹی کے ریکارڈ سے ماخوذ ہے۔

علامہ کے والد محترم شیخ نور محمد دریا دل اور فیاض صفت انسان تھے۔ اور ان کی والدہ امام بی بی شفقت و محبت کا پیکر تھیں۔ امام بی بی کے پانچ بچے تھے۔ جن میں دو لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ انھوں نے بڑے صاحبزادے کا نام شیخ عطا محمد اور چھوٹے کا نام شیخ محمد اقبال رکھا تھا۔ لڑکیاں یکے بعد دیگرے جوارِ رحمتِ الٰہی میں منتقل ہوگئیں۔ علامہ اقبال کو ان کے والد نے ابتدائی تعلیم کے لئے پڑوس کے مکتب میں داخل کیا جہاں انھوں نے پانچ چھ برس گذارے۔ پھر نو برس کی عمر میں اسکول میں داخل ہوئے۔ جہاں ۱۸۹۳ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں چونکہ سیالکوٹ میں میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہیں تھا اس لئے آپ گجرات امتحان دینے کی غرض سے گئے۔ جہاں پر سول سرجن خان بہادر عطا محمد صاحب ان کی ذہانت دیکھکر بہت متاثر ہوئے۔ اور اپنی لختِ جگر ان کے نکاح میں دی۔ اس بیوی سے ان کے دو بچے، ایک لڑکا اور دوسری لڑکی تھی۔ لڑکے کا نام آفتاب اقبال اور لڑکی کا نام معراج بیگم تھا۔ کچھ لوگ لڑکی کا نام مریم بیگم بھی لکھتے ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی بہت جلد اختلاف کا شکار ہوگئی جس کے نتیجے میں علامہ نے دوسری شادی کرلی۔ اس دوسری بیوی سے جاوید اقبال اور منیرہ بیگم پیدا ہوئے۔ جاوید اقبال کا سنہ پیدائش ۱۹۲۴ء اور منیرہ کا ۱۹۳۰ء بتایا جاتا ہے۔

میٹرک کا امتحان پاس کر کے اقبالؔ مشن کالج میں داخل ہوئے۔ ایف۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد بی۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۷ء میں بی اے کا امتحان سیکنڈ کلاس میں پاس کیا۔ اس کے بعد ایم۔ اے (فلسفہ) میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اس امتحان میں واحد کامیاب اُمیدوار ہونے کی حیثیت سے انھوں نے طلائی تمغہ حاصل کیا۔ ۲۳ سال کی عُمر میں ہی جب وہ کالج میں بی۔ اے کے طالبعلم تھے، اُنھوں نے شاعری کے میدان میں پہلا کامیاب قدم رکھا تھا۔ اس زمانہ میں کالج کے ایک مُشاعرہ میں حصّہ لیا۔ جہاں ارشد گورگانی بھی موجود تھے، جن کا شمار اُس وقت کے چوٹی کے شاعروں میں ہوتا تھا۔ اُنھوں نے علامہؒ کے اس شعر پر کافی داد دی۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

یہ شعر سننا تھا کہ وہ پھڑک اٹھے اور کہنے لگے۔ "صاحب زادے! سبحان اللہ! اس عمر میں یہ شعر!!!

بعد ازیں علامہ نے انجمن حمایتُ الاسلام کے جلسوں میں نظمیں پڑھنا شروع کیں۔ اس طرح ان کی شہرت کے پہلے مرحلے کا آغاز ہوا۔ "نالۂ یتیم" ان کی وہ پہلی نظم ہے جسے انھوں نے اس انجمن کے ایک جلسہ میں سال ۱۸۹۹ء میں پڑھی۔ ابتداء میں علامہ اقبالؒ اپنا کلام اصلاح کے لئے داغؔ دہلوی کو بھیجتے تھے۔ مگر بہت جلد داغؔ دہلوی صاحب نے لکھا کہ اب انکے اشعار اصلاح کے محتاج نہیں۔

یُورپ میں قیام کے دوران اقبالؒ نے چاہا کہ شاعری کو قطعی طور پر ترک کر دیں لیکن سر عبدُالقادر اور پروفیسر آرنلڈ نے ان کو اس امر سے باز رکھا۔ یُورپ میں علامہ اقبال نے کیمرج میں تعلیم حاصل کی اور اسی یُونیورسٹی سے فلسفہ اخلاق میں انھیں ایم۔ اے کی ڈگری ملی۔ ۱۹۰۷ء میں جرمن یونیورسٹی نے انکی کتاب "ایران میں فلسفۂ الٰہیات کا ارتقاء" پر ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی۔ اس کے بعد قانون کا امتحان پاس کرنے کی غرض سے وہ لندن چلے گئے۔ جہاں کچھ عرصہ پولٹیکل سائنس اور معاشیات کی تعلیم بھی حاصل کی۔

وطن واپس آنے کے بعد ۱۹۱۱ء تک وہ لاہور گورنمنٹ کالج میں کام کرنے لگے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد یہ نوکری چھوڑ دی۔ علی بخش جو آپ کا نوکر رہا ہے، اس کا بیان ہے کہ جس دن علامہ نوکری سے استعفا دیکر آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ شیخ صاحب! آپ نے نوکری کیوں چھوڑ دی تو کہنے لگے۔ "علی بخش! انگریز کی ملازمت میں بڑی مشکلیں ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ میرے دل میں جو کچھ ہے اسے میں کھلم کھلا بیان نہیں کر سکتا۔ اب میں بالکل آزاد ہوں۔ جو چاہوں کروں اور جو چاہوں کہوں۔ شاید یہ پھانسی جو مدّت سے میرے دل میں کھٹکتی ہے نکل جائے"[1]

علامہ سرکاری ملازمت ترک کرنے کے بعد وکالت کرنے لگے۔ اس پیشہ سے انھیں کافی آمدنی ہو سکتی تھی۔ لیکن کئی وجوہات کی بناء پر وہ اس سے بھی کنارہ کش ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء میں ان کو انکی ادبی خدمات کے پیش نظر "سر" کا خطاب عطا کیا گیا۔

---

[1] سیرت اقبال از محمد طاہر فاروقی، ص: ۳۴۳

علامہ نے اپنے پیچھے بہت سی تصانیف چھوڑی ہیں۔ یہاں ان کو ہم مع سنِ اشاعت اور زبان بطورِ معلومات تحریر کر رہے ہیں۔

نمبر شمار	نام کتاب	زبان	سنِ اشاعت
۱	علم الاقتصاد	اردو	۱۹۰۳ء
۲	ایران میں فلسفہ الٰہیات	انگریزی	۱۹۰۷، ۸ء
۳	ملّتِ بیضاء پر ایک عمرانی نظر	〃	۱۹۰۴ء
۴	اسرارِ خودی	فارسی	۱۹۱۵ء
۵	رموزِ بے خودی	〃	۱۹۱۸ء
۶	بانگ درا	اردو	۱۹۲۴ء
۷	پیامِ مشرق	فارسی	۱۹۲۲ء
۸	زبورِ عجم	〃	۱۹۲۷ء
۹	جاوید نامہ	〃	۱۹۳۸ء
۱۰	اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید	انگریزی	
۱۱	بالِ جبریل	اردو	۱۹۳۵ء
۱۲	پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق	فارسی	۱۹۳۶ء
۱۳	ضربِ کلیم	اردو	۱۹۳۶ء
۱۴	ارمغانِ حجاز	اردو و فارسی	۱۹۳۸ء
۱۵	تاریخ ہند	اردو	۱۹۱۳، ۱۴ء

ان کے علاوہ بھی کچھ کتابیں اور مضامین اقبال اور خطوط اقبال

وغیرہ کے مختلف مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

آخری عمر میں علامہ کے لئے ریاست بھوپال سے وظیفہ مقرر ہو گیا تھا جس کا سلسلہ ان کی وفات کے بعد ان کے بچوں تک چلتا رہا۔

بہر حال اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس قول "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" کے تحت اپنی باری پر اس مردِ قلندر نے اس جہاں فانی کو ۱۹۳۸ء میں الوداع کیا۔ اور اپنے رب کریم کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ بوقت جانکنی، ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ اپنے اس شعر کی مجسم تصویر بنے ہوئے تھے۔

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم　　چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

عاشقانِ رسولؐ اس جہانِ فانی سے جب رخصت ہوتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں۔ یہ خوشی درحقیقت ان کو اپنے محبوبِ حقیقی سے ملنے کی اُمید میں ہوتی ہے۔ راجہ حسن اختر کہتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کی زبان پر وفات سے دس منٹ قبل یہ اشعار تھے۔

سرور رفتہ باز آید نہ آید　　نسیمے از حجاز آید نہ آید
سرآمد روزگار ایں فقیرے　　دگر دانائے راز آید نہ آید

(ابن غلام محمد شاہ قادری)

اوڑورہ، کولگام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قوّت جمیل

ایک ایسی قوت کا نام ہے جس نے اس جسدِ خاکی کو حرکت عطا کر کے چلتا پھرتا بنا دیا۔

انسان جس دنیا میں آباد ہے، اس دنیا کا ہی کیا بلکہ ساری کائنات کا خالق و مالک اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ یہ ساری کائنات اتنی وسیع ہے کہ اس کی وسعتوں کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔ یہ دوسرا سوال ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی کائنات کے بھیدوں کو جاننے کی کوشش کرتا ہے لیکن پہلے اس کو اپنے وجود کی وسعتوں کو جاننا چاہیئے۔ جن اجزاء سے اس انسان کی بناوٹ ہوئی ہے ان سے اس کے وجود کی ایک ایسی کائنات بنی ہوئی ہے جس کی وسعت کائنات حقیقی سے وسیع تر ہے۔ کائنات وجودِ انسان میں سب سے بڑی اور گہری وسعتوں والی جو شئی ہے وہ انسان کی خودی ہے۔ خودی کیا ہے؟ یہی ایک راز ہے جس کا جاننا بہت ضروری ہے۔

اسی بات کو سمجھنے کے لئے قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے انسانی تخلیق سے متعلق کتنے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ کہیں لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ (بہ تحقیق ہم نے انسان کو بڑی محنت و مشقت میں پیدا کیا۔ پ ۳۰، اور کہیں لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (بہ تحقیق ہم نے انسان کو سب سے بہترین ساخت میں پیدا کیا۔ پ ۳۰: التین)

کیونکہ اس کو فکر و فہم اور علم و عقل کی سب صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں) پھر اسی کو سمجھنے اور جاننے کے لئے کہا جاتا ہے اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ (کیا وہ نہیں سمجھتے) یا اَفَلَا یَعْلَمُوْنَ (کیا وہ نہیں جانتے) یا اَفَلَا یَشْعُرُوْنَ (کیا ان کو یہ بات سمجھنے کے لئے شعور نہیں ہے) ہے۔

چنانچہ اس جسدِ خاکی کو ربُّ العزت ایک ایسی قوت سے حرکت عطا کرتا ہے جس کو وہ اپنی رُوح[1] کے نام سے پکارتا ہے۔ اس رُوح کو پھونکنے سے پہلے آدمؑ ایک خاکی تودہ یعنی مٹی کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہی رُوح اس کو جیتی جاگتی صورت میں پیش کرتی ہے۔ یہ رُوح اللہ تعالیٰ کے حکم اور طاقت سے ہے[2]

زندگی کے مدّ و جزر

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی
ہر ذرّہ شہید کبریائی
بے ذوقِ نمود زندگی، موت
تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

(بالِ جبریل)

بالِ جبریل کی اس غزل میں شاعری کم فلسفہ زیادہ ہے۔ اس شعر میں بھی بلاغت کی شان موجود ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق اس نہج پر فرمائی ہے کہ یہاں ہر شئی اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شئی کی فطرت میں نمود کا جذبہ ودیعت

---

[1] ونفخت فیہ من روحی (میں نے اس میں اپنی رُوح پھونک دی) القرآن

[2] الروح من امر ربی (رُوح میرے رب کے حکم سے ہے) القرآن

کر رکھا ہے۔ ہر شئی اپنے مرتبہ کمال کو پہنچنے کے لئے بیتاب ہے۔ اس لئے کہ زندگی کا منشاو مقتضیٰ مرتبہ کمال ہے۔

اس مرتبہ کمال کی خاطر انسان کیا نہیں کرتا ہے۔ حق و باطل کا معرکہ پیش آتا ہے۔ رستم و سہراب کی طوفانی طاقتوں کا منظر سامنے آتا ہے۔ خالد بن ولیدؓ اور صلاح الدین ایوبیؒ کی بے مثال بہادری اور فاتحانہ کارنامے باطل کو صفحۂ ہستی سے مٹاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور کبھی امام حسینؑ کربلا کے ریگستان کو اپنے گرم گرم خون سے حق کی خاطر رنگین بنا دیتے ہیں۔ انسان کی زندگی میں کتنے مدوجزر آتے ہیں اور زندگی کی راہوں میں اس کو کتنی تیز و تند آندھیوں سے مقابلہ پیش آتا ہے۔ پھر مشکلات کے بعد آسائشوں کے باب کھل جاتے ہیں۔ ان آسائشوں کے باغوں میں جو چہل پہل اور مستیاں نظر آتی ہیں ان سے انسان متأثر ضرور ہوتا ہے۔ یہ تأثر صرف دو ہی طرح کا اچھا یا برا ہو سکتا ہے۔ ثانی الذکر تأثر کی وجہ سے ایک شخص کبھی دولت و ثروت کی فراوانی کے سبب عاد و ثمود کی طرح شیخی بگھارنے لگتا ہے اور کبھی اقتدار کے حصول پر فرعون و نمرود کی طرح الٰہیت کا مدعی ہو جاتا ہے۔ پھر نمود و نمائش کے لئے غریب عوام پر ظلم و ستم ڈھا کر ان کو اپنے سامنے سربسجود ہونے پر مجبور کراتا ہے۔ ان برائیوں کے سدباب کے لئے ارشاد ربانی ہے۔

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ۔

اے انسان تمہیں آخر کس بات نے اپنے اُس ربّ کریم کی جانب سے دھوکہ میں ڈال رکھا ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر سنوارا، پھر مکمل کیا اور پھر جس صورت میں چاہا تمہاری تشکیل دی۔ (پ: انفطار)

اللہ تعالیٰ بندے کو تنبیہہ کرتا ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جس نے تجھے ایسے غرور و تکبر میں مبتلا کر رکھا ہے۔ کیا تمہاری تخلیق اُس وقت نہیں لکھی ہوئی جب تمہارا وجود ہی نہ تھا۔ پھر اس وجود کی ایک خاص اہمیت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کو ایک خاص انداز یعنی احسنِ تقویم کے مطابق پیدا کرتا ہے اس لئے اس کے اندر فکر و فہم اور عقل و شعور کی صلاحیت موجود ہے۔ لہٰذا اے انسان تو اس وجود خاکی کے ہر راز کو جاننے کی بلیغ کوشش کر ورنہ تیری ترقی ناممکن ہے۔ تیری ترقی اور سربلندی کا راز تیرے اپنے وجود میں مضمر ہے۔ اگر اس بات کو تم پہچان نہ کر سکے تو اَسْفَلَ السَّافِلِین (نچلے سے نچلا طبقہ) کے درجے میں پہنچ جاؤ گے۔ اس ذلیل و بدترین درجے سے نجات پانے کے لئے جو راز آپ کے اپنے وجود میں موجود ہے اُسی کو اقبالؒ خودی کے نام سے موسوم فرماتے ہیں۔ آپ کی زندگی کی فلاح و سعادت اور آبرو اسی خودی پر منحصر ہے۔ یہ ہو تو پادشاہی نہ ہو تو روسیاہی ہے۔

؎ تیری زندگی اسی سے تیری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو بادشاہی نہ رہی تو روسیاہی

انسان اوّل

انسان کی تخلیق کی ابتدائی کڑی کا سلسلہ عجیب وغریب ہے۔ آدمؑ جو پہلا انسان ہے اس کے ظہور کی ایک دلچسپ اور غور طلب داستان ہے۔ خود ربّ جلیل نے اپنے کلام پاک میں آدمؑ کا تذکرہ پچیس ۲۵ مرتبہ پچاس ۵۰ آیات میں فرمایا ہے۔ آخر یہ راز کیا ہے؟ انسان کی ابتدا کیا ہے؟ کیسے اور کیوں ہوئی انتہا کیا ہے؟

ہر زمانہ اور ہر ملک میں مختلف حکماء و علماء نے اِن سوالات کے مختلف جوابات دئے ہیں۔ جن کو پڑھ کر عقل محو حیرت ہو جاتی ہے۔ تفصیل سے جوابات لکھنا اِس چھوٹی سی کتاب میں مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ کیونکہ یہ ہزارہا سال پر مشتمل فلسفیوں کی تاریخ کے ساتھ منسلک ہے۔ لہٰذا مختصراً قرآنی آیات کے حوالے سے اسے یہاں درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

نظریۂ ارتقاء Evolution کو چھیڑے بغیر ہم انسان کی ابتدائی تخلیق کے متعلق مذہبی معلومات پر ہی بھروسہ کریں گے۔ کیونکہ مذہبی یعنی قرآنی معلومات ہی شک وشبہ سے بالاتر ہیں۔ قرآن حکیم انسان کی ہدایت کے لئے ایک مکمل کتاب اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ انسان کی ابتدائی تخلیق کے بارے میں ہمیں اِس کے اندر بہت ساری معلومات ملتی ہیں ہر چند کہ سب کا ایک ہی مفہوم ہے لیکن ساری معلومات پُراسرار تو ضرور ہیں۔

جب ہم سورۃ 'الحجر' کے آیات کریمہ ۲۶ تا ۳۱ تک کی تلاوت کرتے ہیں تو ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانِ کی تخلیق ' ارتقاء (Evolution) سے نہیں بلکہ خالق کائنات نے انسانِ اوّل کو آدمؑ کی شکل میں پیدا کیا جس کی طرف اس طرح اشارہ فرمایا گیا ہے :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝

(القرآن)

ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے بنایا۔ اور اس سے پہلے جنوں کو ہم آگ کی لپیٹ سے پیدا کر چکے تھے۔ پھر یاد کرو اُس موقعہ کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ جب میں اُسے پورا بناؤں اور اُس میں اپنی رُوح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔

یہاں اس امر کی طرف صاف اور واضح اشارہ ہے کہ آدمؑ سے پہلے اِس دُنیا میں ایک مخلوق تھی جن کو جنّات کہتے ہیں۔ اور پھر جنّات کے مادۂ پیدائش کی طرف اشارہ کے ساتھ ساتھ آدمؑ کے تخلیقی مادّہ کا بھی ذکر ہے۔ یہ اِنسان (آدمؑ) ارض وسمآء کے وجود میں آنے سے قبل یا بعد میں پیدا کیا گیا ہے، یہ ایک طویل بحث ہے۔ لیکن قرین قیاس رائے یہ ہے کہ آدمؑ ارض وسمآء کے وجود میں آنے کے بعد پیدا کیا گیا۔ دُنیا میں کوئی چیز خود پیدا نہیں ہوئی اور نہ ہوگی بلکہ پیدا

کی جاتی ہے یا کی گئی ہے۔ اس طرح انسان ہے کہ یہ کیسے بنایا گیا؟ یہاں مذکورہ آیات میں اس حقیقت کو واشگاف کیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ فرشتوں کے ذریعے سے سارے اقالیم کی مٹی کے ست کو یکجا کیا گیا جس سے پھر آدمؑ کا پُتلا بنایا گیا۔ پھر اس جسد خاکی میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رُوح پھونک کر اس بے جان کے اندر جان ڈال دی اور تب اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے خاص خطاب "خلیفۃ اللہ" سے نوازا۔ قرآن عزیز کی تذکیر و دعوت، اوامر و نواہی اور رُشد و ہدایت کا مخاطب اور مبدء و معاد کا محور و مرکز صرف ایک ہستی ہے اور اس ہستی کو انسان کہتے ہیں۔ حضرت آدمؑ کے واقعہ تخلیق میں بیشمار پند و نصائح پنہاں ہیں اور اس میں اسرار و رموز کا ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن ان کا یہاں احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ غرض انسانوں اور جنّوں کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے گی۔ فرمانِ ربّ العزّت ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ یعنی جنّ و انسان کو میں نے صرف اس غرض کے لئے پیدا کیا ہے تاکہ وہ اپنی ساری زندگی میرے ہی حکموں کے تحت بسر کریں۔

اِبتداء نہیں، اِنتہا کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے بھید
یعنی راز اتنے اَن گنت، لاتعداد

وبے شمار ہیں کہ ان سے کوئی بھی حتّٰی کہ اللہ تعالیٰ کے مقرّبین بھی بآسانی واقف نہیں ہو سکتے ہیں سوائے اُن کو جن کو اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ اسی لئے مَلائکۃ اللہ انتہائی مقرّب ہونے کے باوجود خلافتِ آدمؑ کی حکمت سے ناشنا ہو سکے اور جب تک تخلیق آدمؑ کی حقیقت سامنے

نہ آگئی، حیرت میں ہے ۔ اِسی فکر بیچارگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے :۔

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتداء کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں، میری انتہا کیا ہے

یعنی میں حکماء سے یہ دریافت کرنا نہیں چاہتا ہوں کہ میری ابتداء کیا ہے ؟ کیونکہ مجھے اس بات کا علم ہے کہ دُنیا کا کوئی بھی فلسفی اس بنیادی سوال کا صحیح اور تسلّی بخش جواب نہیں دے سکتا ہے کہ انسان کی ابتداء کیونکر ہوئی ؟ وجہ یہ ہے کہ اس سوال کا جواب عقل کی دسترس سے بالاتر ہے ۔ اب جبکہ یہ مسلّم بات ہے کہ مجھے اپنی ابتداء کا علم حاصل نہیں ہوسکتا ہے تو میں اس ناممکن بات کے جاننے میں اپنا وقت ہی کیوں ضائع کروں ۔ میرے اس کے بجائے یہ بہتر ہوگا کہ میں اپنی انتہا کے بارے میں غور و فکر کرتا رہوں ۔ یعنی میں یہ دیکھنے کی کوشش کروں کہ رُوحانی اعتبار سے انسان کہاں سے کہاں تک ترقی کرسکتا ہے ۔ بنابریں ایک انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنی ابتداء پر غور کرنے کے بجائے اپنی پُوری توجہ اِس امر کی طرف مبذول کرے کہ نفسِ امّارہ یا نفسِ مادّہ کو نفسِ مُطمئنہ کے مقام پر کیسے پہنچائے ۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہر چند کہ ابتداء کے علم سے ناواقف رکھا ہے لیکن اسے انتہا کے علم کے حصول کی ہدایت فرمائی ہے ۔ علامہ اقبالؒ نے مذکورہ بالا شعر میں یہی دعوٰی کیا ہے کہ انسان کو اپنی ابتداء کا علم حاصل نہیں ہوسکتا ہے ۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ انسان ازلی ہے اور اس میں رُوح نہیں ہے سالیمات مادّی کے امتزاج سے خود بخود پیدا ہوگیا ہے ۔ نہ اس کا کوئی

خالق اور نا ہی اس کی پیدائش کا کوئی مقصد ہے۔ مرنے کے بعد ہمیشہ کیلئے فنا ہو جائے گا۔ یہ مادّیت پرستوں کا نظریہ ہے۔

جین دھرم نے انسان کو سالمیات مادّی اور رُوح دو چیزوں کا مجموعہ بتلایا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ازلی ہیں۔ رُوح جسم کی قید میں ہے اِس کے برعکس ہندو دھرم کی تعلیم ہے کہ جب رُوح جسم کی قید سے رہا ہو جائے گی تو ایک عرصۂ معیّن تک آزاد رہے گی لیکن اس کے بعد پھر قید میں مُبتلا ہو جائے گی۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ یہ گروہ خُدا کی ہستی کا بھی معترف ہے۔ غرض اس طرح ہر گروہ اپنی ایک الگ الگ رائے پیش کرتا ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔ یعنی اسے نیست سے ہست کیا ہے اور اس کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کی پابندی کرکے دُنیا میں خلافتِ الٰہیّہ کا مرتبہ حاصل کرے۔

خلافت اور تحقیق لفظ خلیفہ

اللہ ربُّ العزّت نے جب زمین پر آدمؑ کو بنانا چاہا تو فرشتوں سے یہ نہیں کہا کہ میں زمین پر آپ کے علاوہ ایک اور مخلوق بنانا چاہتا ہوں جسے آدمؑ کے نام سے پکارا جائے گا بلکہ یُوں فرمایا کہ اے فرشتو! میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً

(القرآن، پ۱: سورۃ البقرۃ)

اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ بے شک میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

خلیفہ کے معنی ہیں کسی کا جانشین ہونا، کسی کی نیابت کرنا۔ المنجد

KHALID ACADEMY

میں لکھا ہے " خَلَفَہٗ (ن) خِلَافَۃً وَخَلِیفَیٰ " جانشین ہونا ۔ رَبَّہٗ فِی قَوْمِہٖ ۔ جانشین بنانا ۔ الرَّجُلُ ۔ کسی کی غیر حاضری میں اُس کا قائم مقام ہونا ۔ یا ایک دوسرے کا قائم مقام ہونا ۔ اسی سے 'الخلافت' بھی ہے ۔ جس کے معنیٰ ہیں امارت' امامت' جانشینی ۔ خُلَفَا وَخَلِفَۃً' خِلَافَۃً ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے یہ بھی فرمایا کہ خمیر اُٹھے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے' ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں اور جب یہ وجود پایۂ تکمیل کو پہنچے گا' میں اس کے اندر اپنی رُوح پھونک دوں گا ۔ تب تم اے ملائکہ! اُس کو سجدہ کرنا' کہ سجدہ کرنا درحقیقت میری رُوح کی تعظیم ہوگی ۔ ساتھ ہی ملائکہ کو یہ بھی بتلایا کہ یہ زمین پر میرا خلیفہ ہوگا اور اختیار وارادہ کا مالک ہوگا اور میری زمین پر جس طرح تصرّف کرنا چاہے گا' کرسکے گا ۔ گویا وہ میری قُدرت اور میرے تصرّف واختیار کا " مظہر " ہوگا ۔ گویا لفظِ خلیفہ میں یہ تمام باتیں پنہاں ہیں ۔ ان تمام باتوں کو سمجھنے کے بعد فرشتوں نے حیرت واستعجاب کے عالم میں خداوند قدس سے پوچھا ۔ اے اَحْکَمُ الحَاکِمِیْن! کیا ہم آپ کی تسبیح وتحمید ادا کرنے میں کوئی کسر باقی رکھتے ہیں جو آپ یا ربّ العالمین ایسی مخلوق کو پیدا کرتے جاتے ہیں ۔ پھر فرشتے یوں گویا ہوئے ۔ " اے پروردگار! کیا آپ اس کو پیدا کرنا چاہتے ہیں جو زمین پر فتنہ وفساد اور خونریزیاں برپا کرے گا ۔ دراصل فرشتے دربارِ الٰہی سے قُرب کے باوجود اسرارِ الٰہیہ سے ناواقف تھے ۔ اسی لئے خُدائے ذُوالجلال نے ان سے فرمایا " اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ بے شک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو ۔" (سورۃ البقرۃ ' پ۱)

مردِ مؤمن

اقبالؒ نے مردِ مؤمن کی تعریف کرتے ہوئے اِس کو خلافتِ الٰہیہ کا صحیح حقدار بتلایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ مردِ مؤمن وہ ہے جو اوصافِ حمیدہ میں اکمل ہو اور انسانیت کے عظیم مرتبہ پر فائز ہو۔ اسی طرح اقبالؒ کا مردِ مؤمن خدائی صفات سے متّصف ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتا ہے کیونکہ وہ خلیفہ ہے اور اُسے خلافتِ الٰہی کے فرائض انجام دینے ہوتے ہیں۔ خلیفہ میں حاکم کی صفات کا ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ خلیفہ عناصر پر حکمرانی کرتا ہے۔ نیابتِ الٰہی کے اس مرتبۂ پر پہنچنے کے لئے اطاعت اور ضبطِ نفس کے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ اقبالؒ کے مردِ مؤمن کا تصوّر کس بات پر مبنی ہے؟ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خلافتِ الٰہیہ کے تصوّر پر مبنی ہے اس لئے وہ اپنی رہنمائی کے لئے ہمیشہ قرآن کو ہی منبع و مرجع سمجھتا ہے اور یہی اُن کے نظریۂ خودی کی اوّل اور آخری اساس ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں "الانسانُ الکامل" تخلیقِ کائنات کا اصلی مقصد ہے اور "الانسانُ الکامل" سے مراد صرف حضرتِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ ابنُ العربی اور دوسرے صوفیاء انسان کامل کی انتہا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی ذات میں اپنے وجود کو ضم کردے لیکن اس کے برخلاف علامہ اقبالؒ کے نزدیک انسانِ کامل وہ ہے جو اپنے اندر خدائی صفات کو پیدا کرتا ہے اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھتا ہے، وہ اپنے وجود کو ہر حال میں برقرار رکھتا ہے۔

پہچان

کسی شخص یا شیئی کے متعلق کامل علم ہونے اور اُس کے ہر پہلو اور ہر حال سے واقف ہونے کا نام پہچان ہے۔ علم کسی شخص یا شیئی کی تصویر کو ذہن میں لانے کا نام ہے۔ جیسے ہم نے حمید کا ذکر کیا اور اس ذکر کے ساتھ اس کی جو تصویر ہمارے ذہن میں آگئی اُس کو علم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی چیز سے متعلق جو خیال ہمارے ذہن میں آتا ہے اُسے اس چیز کا علم کہتے ہیں۔ اب یہ شخص یا یہ چیز کیسے وجود میں آیا ؟ کیوں آیا ان سب باتوں کے جاننے کا نام بھی علم ہے۔

انسان کے لئے اپنی ذات کی پہچان ہر حال میں بہت ہی اہم ہے۔ اس کے وجود کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ظاہری صورت اور دوسری باطنی صورت۔ دونوں صورتوں کی پہچان کے لئے علم کا ہونا لازمی ہے۔ ظاہری صورت کو ہم بہ آسانی ظاہر کی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں لیکن باطنی صورت کو باطنی آنکھ کے بغیر دیکھنا ناممکن ہے۔ خالقِ کائنات نے انسان کی تخلیق کو سب سے احسن تخلیق بتایا ہے۔ اِس احسن تخلیق کی کوئی نظیر نہیں ہے اور نا ہی ہوسکتی ہے۔ اگر ساری دُنیا کے علماء، حکماء و فلاسفہ سب اکٹھے ہوکر ہزاروں کیا لاکھوں سال تک غور و فکر کریں کہ اللہ تعالیٰ کی اس احسن و اعلیٰ تخلیق کے کسی بھی عضو کی مثیل بنائیں تو نہیں بنا سکیں گے۔ مثلاً دانتوں کے بجائے کوئی دوسری چیز یا آنکھ، ہاتھ، کان وغیرہ کے بجائے کوئی دوسری بہترین یا اس

کے مثل صورت بنائیں تو نہ اس کے مثل اور نہ ہی اِس سے بہتر بنا سکتے ہیں۔ اس ظاہری صورت یعنی بدن جس میں ہاتھ، پاؤں، کان، سر، مُنہ، وغیرہ ہیں، کو ہم بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن دوسری چیز جس نے اس ڈھانچہ کو حرکت عطا کر کے اعلیٰ شان بخشی ہے وہ کیا ہے؟ اس کو ہم دل، نفس یا رُوح کے نام سے جانتے ہیں۔ یہی اس انسان کی باطنی صورت ہے جس کو صرف باطنی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے۔ اس کے بغیر انسان صرف ایک ڈھانچہ ہے اور اس ڈھانچے کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ دونوں صورتوں کی عزت افزائی فرمائی ہے۔ جسم کی عزت افزائی یوں ہے کہ حضور رحمتِ عالمؐ نے فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندے سے پُوچھے گا کہ فلاں وقت جب میں بیمار تھا آپ نے میری بیمار پُرسی نہیں کی اور فلاں وقت جب میں بھوکا تھا، مجھے کیوں نہیں کھلایا۔ فلاں وقت جب میں مصیبت زدہ تھا، میری ڈھارس کیوں نہیں بندھائی اور میری مدد کیوں نہیں کی۔ اس کے جواب میں بندہ عرض کرے گا۔ اے میرے اللہ! تو خوب جانتا ہے کہ تجھے بھوک لگتی ہے اور نا ہی تو کسی قسم کی مدد کا محتاج ہے۔ ہم سب تیرے ہی محتاج ہیں۔ اسی طرح تجھے کسی بیماری کا اندیشہ یا خطرہ نہیں ہے۔ ہاں اس کی قسم کی آزمائشوں میں صرف ایک بندہ ہی مبتلا ہو سکتا ہے اور ہم بندوں کو ہی قوتِ لایموت کی حاجت ہوتی ہے یہ سُن کر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نے سچ کہا اے میرے بندے! لیکن جب میرا فلاں بندہ فلاں وقت بیمار تھا، میں اُس کے پاس ہی تھا۔

اس حدیث کے الفاظ درج ذیل ہیں:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ رض
قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ
اللّٰہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ
یَا ابْنَ اٰدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِیْ
قَالَ یَا رَبِّ کَیْفَ اَعُوْدُکَ
وَ اَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ
قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ
عَبْدِیْ فُلَانًا مَرِضَ
فَلَمْ تَعُدْهُ اَمَا
عَلِمْتَ اَنَّکَ لَوْ
عُدْتَہٗ لَوَجَدْتَنِیْ عِنْدَہٗ
یَا ابْنَ اٰدَمَ اسْتَطْعَمْتُکَ
فَلَمْ تُطْعِمْنِیْ قَالَ
یَا رَبِّ کَیْفَ اُطْعِمُکَ
وَ اَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ
قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّہٗ
اسْتَطْعَمَکَ عَبْدِیْ
فُلَانٌ فَلَمْ تُطْعِمْہُ اَمَا عَلِمْتَ
اَنَّکَ لَوْ اَطْعَمْتَہٗ لَوَجَدْتَ
عِنْدِیْ یَا ابْنَ اٰدَمَ
فَلَمْ تَسْقِنِیْ

سیدنا حضرت ابو ہریرہ رض روایت
فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ اللہ تعالیٰ
قیامت کے دن فرمائے گا اے ابن آدم
جب میں بیمار تھا پھر تم نے میری عیادت
کیوں نہیں کی۔ یہ شخص عرض کرے گا اے
پروردگار کیسے میں آپکی عیادت کرسکتا تھا
تم تو سارے عالموں کے پالنے والے ہو۔
اللہ فرمائے گا کیا تم نہیں جانتے تھے کہ میرا
فلاں بندہ بیمار تھا پھر تم نے اس کی عیادت کیوں
نہیں کی۔ کیا تجھے یہ خبر نہیں ہے کہ اگر تو اس کی
عیادت کو جاتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا
اے ابن آدم! جب تم کو میں نے کھانا مانگا
تو تم نے کیوں نہیں دیا۔ بندہ عرض کریگا
اے رب یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ میں آپ کو
کھلاؤں تم تو سارے عالموں کے پروردگار
ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا فلاں بندہ
جب بھوکا تھا اگر تو اس کو اس وقت
کھلا دیتا تو مجھکو تو اس بندے کے
پاس پاتا۔ اللہ تعالیٰ پھر فرمائے گا۔
کہ اے ابن آدم! تو نے مجھے کیوں نہیں
پلایا جبکہ میں نے تجھ سے پانی مانگا

قَالَ يَا رَبِّ كَيْفَ أَسْقِيْكَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ قَالَ اسْتَسْقَاكَ عَبْدِيْ فُلَانٌ فَلَمْ تَسْقِهِ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ لَوْ سَقَيْتَهُ وَجَدْتَ ذَالِكَ عِنْدِيْ

(مسلم، مشکوٰۃ صفحہ ۳۰۲)

یہ سن کر بندہ عرض کرے گا۔ اے رب بھلا میں کس طرح آپ کو پلاتا۔ تم تو سارے عالموں کے پروردگار ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا فلاں بندہ پیاسا تھا۔ تُو نے اس کو کیوں نہیں پلایا۔ کیا تو یہ نہیں جانتا تھا کہ اگر تو نے اُس کو پانی پلایا ہوتا تو مجھے تُو اس کے پاس ہی پاتا۔

(الحدیث)

اس طرح ہم اس نتیجہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ابن آدم پر اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہے کہ وہ ہماری اس ظاہری صورت کو بھی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ یوم الدین کے موقعہ پر بندہ سے فرمائے گا کہ اگر تو میرے محتاج بندے کی مدد کرتا کھانا کھلاتا اور پانی پلاتا یا بیمار پُرسی کرتا تو گویا تُو یہ سب کچھ میرے ہی لئے کرتا۔ اس حقیقت کی روشنی میں ہم دو نکتوں تک پہنچتے ہیں۔

دو نکتے

ان دو نکتوں میں ایک نکتہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ انسان کے اس وجود میں موجود ہوتا ہے یا بالفاظ دیگر یہی وجود خدائی نمود ہے اس لئے بندے کی تکلیف کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تکالیف سے تعبیر کیا اور فرمایا کہ جب میں

بیمار تھا یا جب میں بھوکا تھا، پیاسا تھا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان باتوں سے منزّہ اور پاک ہے۔ چنانچہ حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز جب میں اپنی سخت ریاضت اور مجاہدہ سے خدا کی تلاش میں عرش بریں کے پاس پہنچا تو عرض کرنے لگا کہ اے عرش مجید! اس جملے کے جواب میں مجھ سے کہا گیا ہے " الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى " (خدائے رحمان عرش مجید پر ٹھہرا ہوا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ کا مسکن عرش پر ہے۔ پھر آواز آئی کہ "اے بایزید بسطامیؒ آپ سے ہم نے یہ کہدیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کے دلوں میں ہے یعنی قلبِ مؤمن اللہ تعالیٰ کا مسکن ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جو بے انتہا محبت اور پیار اپنے بندوں کے ساتھ ہے۔ اُسی کا ایک مُظاہرہ مذکورہ حدیث سے ہوتا ہے۔ جس طرح ہم اپنے کسی قریبی رشتہ دار سے کہتے ہیں کہ اُس کی تکلیف ہماری اپنی تکلیف ہے۔ یا کوئی شخص اپنے رفیق خاص سے کہتا ہے کہ تمہاری تکلیف میری اپنی تکلیف ہے اور تمہاری خوشی میری اپنی خوشی ہے۔ یہاں حدیث مذکورہ بالا میں بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر بہت مہربان ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی تکلیف کو اپنی تکلیف اور اس کی بھوک و پیاس کو اپنی بھوک و پیاس قرار دیتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی قرابت، ہمدردی، غمگساری اور غمخواری کا اظہار کرتا ہے۔ اگرچہ یہاں اس حدیث سے اللہ تعالیٰ بندوں کو آپسی ہمدردی اور غمگساری کا درس بھی دے۔

تاہم اس سے جسم خاکی کو جو قدر و منزلت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اُس کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ ہر چند کہ اس خاکدان گیتی میں یہ جسدِ خاکی بہت ہی ناپاک اور غلیظ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی عزّت افزائی کر کے انسان کو اپنی شان بخشی اور یہ شان صرف جذبہ عبودیّت سے ہی منوّر و مزّین ہو سکتی ہے۔ ورنہ انسان کا یہ جسدِ خاکی بے انتہا غلیظ ہے۔ امام غزالیؒ اس حقیقت کے متعلق ایک واقعہ یوں نقل کرتے ہیں :

ایک روایت

ایک روز شیخ ابُوسعید قدس سرہٗ صوفیوں کے ساتھ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ ایک مقام پر پہنچے تو دیکھا وہاں لوگ نجاست صاف کر رہے ہیں اور راستہ میں پڑی نجاست کو ہٹا رہے ہیں۔ یہ دیکھکر شیخ کے ساتھی ناک بند کر کے ایک طرف بھاگنے لگے۔ لیکن شیخ ممدوحؒ وہیں پر کھڑے ہو کر فرمانے لگے۔ اے لوگو! کیا تم جاننا چاہتے ہو کہ یہ نجاست مجھ سے کیا کہتی ہے؟ لوگ عرض کرنے لگے۔ یا شیخ! فرمائیے، کیا کہتی ہے؟ فرمایا، سنو! غور سے سنو۔ یہ کہتی ہے کہ کل میں بازار میں تھی۔ تو لوگ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ یعنی جب میں اپنی اصل صورت میوہ، مٹھائی، جنس وغیرہ کی صورت میں تھی تو سب لوگ مجھے مول خریدنے کے لئے روپیوں کی تھلیاں مجھ پر لٹاتے تھے۔ لیکن صرف ایک شب میں تمہاری پیٹ میں رہی تو متعفّن اور نجس ہو گئی۔ اب بتائیے کہ مجھکو تم لوگوں سے بھاگنا چاہیئے یا تم لوگوں کو مجھ سے

نفس اور آفاق کی پہچان

جہاں اللہ تعالیٰ انسان کو اس کائنات اور اس کے راز و اسرار کی تلاش کا حکم دیتا ہے وہاں اس کو اپنے نفس یعنی اپنی ذات کو پہچاننے کا حکم بھی صادر فرماتا ہے ۔ اس حکم کا مدّعا و مقصود یہ ہے کہ اپنی ذات کے عرفان کے بعد انسان اللہ تعالیٰ کو پہچان جاتا ہے ۔ مذکورہ حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآنِ حکیم کی درج ذیل آیت میں فرماتا ہے :

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (القرآن: حٰمٓ السجدۃ)

ہم اُن کو دکھاتے ہیں اپنی نشانیاں کائنات کے اندر بھی اور اُن کی اپنی ذاتوں میں بھی تاکہ حقیقتِ حق اُن پر ظاہر ہو جائے

یہ الفاظ دیگر یہاں دو چیزوں کے گہرے اور عمیق لیکن نصیحت آموز مطالعے کی طرف انسان کی توجّہ دلائی گئی ہے ۔ ایک اس کائنات کے مطالعے کی طرف اور دوسرا انسان کے اپنے نفس کی طرف ۔ کائنات یا آفاق کے مختلف گوشوں کا مکمّل علم ہونا انسان کے لئے مشکل ہے ۔ کیونکہ کائنات اتنی وسیع ہے کہ اس کا احاطہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ۔ آج کل ہم یہ دیکھ رہے ہیں

کہ اس کی وُسعت بڑھتی جارہی ہے ۔ اس سلسلے میں قُرآن کریم کا ارشاد ہے :

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (الذّٰریٰت) — آسمانوں کو ہم نے اپنی طاقت سے بنایا اور ہم اس میں توسیع کر رہے ہیں۔

لفظ لَمُوْسِعُوْنَ کا ترجمہ ہے " وُسعت کرنے والے"۔ مُوسِعون اَوْسَعَ کا معنیٰ وسیع کرنا ہے یعنی زیادہ کُشادہ، وُسعت دیا ہوا۔ پھیلا ہوا۔ چنانچہ جن کو دوُربینوں کی مدد سے دیکھا گیا ہے صرف اُن کی تعداد ہی دس کروڑ ہے۔ اس کے علاوہ اور کتنے سیارے اور ستارے ہیں اُن کے بارے میں سوائے خُدا کے کسی کو علم نہیں ہے جو کہکشانی نظام ہم سے قریب ترین ہے۔ اُس کا فاصلہ ہماری زمین سے اتنا دوُر ہے کہ وہاں سے روشنی کو ہم تک پہنچنے میں تقریباً نو لاکھ سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ہمارے کہکشانی نظام میں ہی تقریباً ایک کھرب نصف ستارے ایسے ہونے چاہئیں جن کا سوُرج کی طرح نظام شمسی ہے۔ پچاس ارب ستارے یقیناً ایسے ہیں جو سوُرج کے مانند نہایت آہستہ آہستہ گردش کرتے ہیں۔ بہرحال ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اس کائنات کا اندازہ لگا سکے کہ یہ کتنی وسیع ہے[1]

اب جو دوسری چیز نفس یعنی اپنی ذات کی پہچان کے بارے میں ارشاد ربّانی ہے وہ بھی اسی طرح انتہائی وُسعت والی شیئی ہے۔ چنانچہ انسان اس کائنات کے رازوں کے جاننے اور پہچاننے کی تگ ودو میں

---

[1] راقم نے اپنی تصنیف " الحقائقُ العصریہ فی دقائق الایمانیۃ" (یعنی زمانے کی حقیقتیں ایمان کی باریکیوں میں) میں تشکیل کائنات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

لگا ہوا ہے ۔ لیکن اپنی ذات اور نفس کے علم سے بے خبر ہے ۔ اس سے انکار نہیں ہے کہ ایک انسان کو کائنات کے علم سے بھی بہرہ ور ہونا لازمی ہے ۔ لیکن اس کائنات کے علم سے قبل انسان اپنی ذات اور نفس سے بھی مکمل طور واقف ہو ۔ اس طرح کہ اس کو اپنے وجود کی بخوبی پہچان ہو ۔ اسی پہچان کو ہم بہ آسانی خودی کی پہچان کہہ سکتے ہیں اور یہی پہچان خدا کی معرفت کا ذریعہ ہے ۔ اب ہم انسان کی ذات اور نفس کی وسعتوں کے بارے میں بالاختصار تحریر کر رہے ہیں تاکہ ہم اپنی ذات کے متعلق قدرے واقف ہو جائیں اور ہمیں خودی کی پہچان بآسانی حاصل ہو جائے ۔

انسان اور حیوان

یوں تو حیوان بھی اپنے کو پہچانتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک انسان اپنے مُنہ، ہاتھ، کان، پاؤں، سر، گوشت، وغیرہ یعنی اپنے سارے بدن کو پہچانتا ہے، پھر اپنے باطن کا حال بھی جانتا ہے وہ اس طرح کہ بھوک لگنے پر غذا کھاتا ہے، غصہ ہو تو لڑائی کرتا ہے، شہوت ہو تو نکاح کا ارادہ کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ گو ان باتوں میں انسان اور حیوان برابر ہیں۔ لیکن پھر کیا بات ہے کہ انسان کے حق میں فرمایا گیا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ	یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم
وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ	کو بزرگی دی اور انھیں خشکی و تری میں سواریاں
وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ	عطا کیں اور اُن پاکیزہ چیزوں سے رزق
وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ	دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں
خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۷: ۷۰)	فوقیت بخشی

اِس خاص اعزاز سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو نوازا وہ اس طور پر کہ اس کو کائنات کی جمیع مخلوقات میں بے مثال رِفعت اور شرفِ عظیم عطا

عطا کر کے اعلیٰ علیین کے درجے تک پہنچا دیا۔ پھر جملہ بحر و بر اور شام و سحر کو اس کے زیر نگین رکھا اور اس کو اپنی پاک روزی سے کھلایا، پلایا۔ نیز جن جن کو فضیلت سے نوازا اُن سب میں بہترین فضیلت اور اپنے بہترین انعام و اکرام سے صرف اسی انسان کو نوازا اور اس کو اشرف المخلوقات کے معزز القاب سے سرفراز فرمایا۔

لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی حقیقت یا خودی کے بارے میں علم حاصل کرنے کی راہ میں سرگرداں رہے اور ان سوالات کے جوابات تلاش کرے کہ وہ کہاں سے آیا؟ کدھر کو جانا ہے؟ کیوں اور کس کام کو انجام دینے کے لئے آیا ہے؟ اُس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ جب تک ان باتوں کے متعلق علم نہ ہو، ابدی سعادت کا حاصل کرنا انسان کے لئے ناممکن ہے حیوان کی سعادت الگ ہے اور انسان کی سعادت الگ۔

سونا، پینا، کھانا پھر موٹا ہونا یہ تمام اعمال انسان اور حیوان دونوں کے اندر مشترک ہیں لیکن حیوانوں کی سعادت صرف انھیں اعمال پر منحصر ہے۔ اگر انسان بھی چارپا ہوتا تو اس سے کسی اور بات کی توقع کرنا فضول ہے۔ دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مار ڈالنا، کاٹنا اور جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا وغیرہ درندوں کے اعمال ہیں! اور انھیں اعمال کی تکمیل ان کی سعادت کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح شر، حیلہ اور مکر کرنا شیطان کی غذا اور سعادت ہے جب انسان بھی ان خصائل میں مبتلا ہو اور رات دن انھیں کاموں میں گذارے تو اُسے درندہ یا شیطان کہا جائے گا کیونکہ شیطان اور درندے انھیں خصائل کو ہی اپنے لئے عین سعادت سمجھتے ہیں۔ اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے اگر انسان ان تمام بُرے خصائل کو ترک کر دے اور ان سے

باز رہے تب ہی وہ انسان کہلائے جانے کا حقدار ہے۔ خُدا کا جمال دیکھنا فرشتوں کی خصلت اور سعادت ہے۔ چارپایوں، درندوں، حیوانوں کی صفات کا اُن کے یہاں گذر نہیں ہے۔ اب اگر انسان فرشتوں کی اصل رکھتا ہے تو جناب الٰہی کو پہچاننے کے لئے اپنی اصل کو پہچاننے کی کوشش اور خودی کے رازوں سے آشنائی حاصل کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کے جمال کے مُشاہدے کی راہ اس کے سامنے آسان ہو۔

یہاں انسان کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر چرندوں، پرندوں، درندوں کی صفتیں کیوں ودیعت کی ہیں۔ کیا بنی آدم کو ان کے اوصاف کا غلام بنانا تھا، ہرگز نہیں۔ بلکہ دراصل یہ بات تھی کہ انسان ان کو اپنے قابو میں لاکر اپنا تابع بنائے اور ان کو ہتھیار کے طور استعمال کرکے ان کی مدد سے اپنی سعادت کا بیج بوئے جو انسان ان سارے خصائل کو اپنے نفس یا جس کو اقبالؔ نے خودی کا نام دیا ہے، کی گرفت میں لاکر ان کو اپنا مطیع و فرماں بردار بناتا ہے۔ وہ شخص انسانیت کے اعلیٰ مقام پہ پہنچ جاتا ہے۔ اسی مقام کو خاص لوگ مقامِ جنابِ الٰہیت اور عام لوگ مقامِ جنّت کہتے ہیں۔ دراصل اقبالؔ خودی کی تعریف میں اسی بات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خودی کا دوسرا نام نفس، دل یا رُوح ہے، جس کی قید میں یہ سارے خصائل موجود ہونے چاہئیں۔ بنی نوع انسان کے اندر دوسری چیز اہم اور اصل ہے وہ یہی رُوح، نفس یا دل ہے۔ یہاں دل سے مراد گوشت کا وہ لوتھڑا نہیں ہے جو سینہ میں بائیں طرف موجود ہے۔ ابھی آپ نے پڑھا ہے کہ انسان کی دو صورتیں ہیں ایک ظاہری جس کو ظاہری آنکھ سے اور دوسرا باطنی جس کو باطنی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ جو چیز ظاہری آنکھ

سے دکھائی دے وہ اُس عالم سے ہے جس کو عالم شہادت کہتے ہیں ۔ رُوح کی حقیقت عالم شہادت سے تو نہیں ہے، ہاں اس عالم میں مُسافر کے طور آیا ہے ۔ اور یہ بدن جس کو ظاہری صُورت کہتے ہیں جس میں آنکھ، کان، ناک، سر وغیرہ شامل ہیں، یہ سب رُوح کا لشکر ہیں اور وہ اُن کا بادشاہ اور افسر ہے۔ رُوح کا تعلق دوسری صورت یعنی باطنی صُورت سے ہے ۔ اس لئے اس کو باطنی آنکھ سے ہی دیکھ سکتے ہیں ۔ خُدا کی معرفت اور اس کے جمالِ بے مثال کا مُشاہدہ صرف رُوح کے ذریعے ممکن ہے ۔ احکامِ الٰہیہ کا خطاب رُوح سے ہی ہوتا ہے ۔ اور اسی کو ثواب و عذاب سے دوچار کیا جائے گا ۔ سعادت و شقاوت اسی کے لئے ہے ۔ اسی نے ازل میں ' اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ' (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں ؟) کا جواب دیا ہے ۔ اے انسان تو اس کی حقیقت اور صفتوں کو پہچان ۔ کیونکہ خُدا کی معرفت کا صرف وہی ایک ذریعہ ہے ۔

رُوح کیا ہے؟

رُوح یا دل ایک عمدہ گوہر ہے۔ گوہر چونکہ ملائکہ کی جنس ہے۔ درگاہ الوہیت اور ربوبیت اس کا اصلی معدن ہے۔ وہیں سے آیا ہے اور وہیں پھر جائے گا۔ یہ یہاں مسافرانہ آیا ہے، تجارت و زراعت کے لئے آیا ہے۔ "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ" (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) انسان کو چاہیئے کہ وہ دل کی ہستی کو جان لے اور اس کے جاننے سے وہ حقیقت ازلی تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ دل سے ہماری مُراد رُوح ہے۔ اس کے بغیر ظاہری ڈھانچہ یعنی بدن مُردہ ہے۔ اس پس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ دل کی ہستی کتنی عظیم ہستی ہے۔ دل کیا ہے؟ دل کی خاص صفت کیا ہے؟ اُس کے بیان کرنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی۔ جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت سے صاف ظاہر ہے:

وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا

(بنی اسرائیل)

(یا محمدؐ) آپ سے یہ رُوح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ فرمادیجئے۔ رُوح میرے رب کے حکم سے ہے۔ اس بارے میں مجھے جو علم دیا گیا ہے وہ بہت کم ہے۔

رُوح اللہ کے کاموں اور عالم امر سے ہے۔ بس اتنا ہی کہنے کی اجازت ہے۔ اسے زیادہ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ الحجر کی آیت ۲۹ میں اس امر کی طرف مزید اشارہ ملتا ہے[1]۔ اس آیت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر جو رُوح پھونکی گئی ہے وہ دراصل صفاتِ الٰہیہ کا ایک عکس یا پَرتو ہے۔ حیات، علم، قُدرت، ارادہ، اختیار اور دوسری جتنی صفات انسان میں پائی جاتی ہیں اُنہی کے اس مجموعے کا نام رُوح ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا ایک ہلکا سا پَرتو ہے جو اس لبدِ خاکی پر ڈالا گیا ہے اور اُسی پَرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خُدا کا خلیفہ اور ملائکہ سمیت تمام موجوداتِ ارضی کا مسجود قرار پایا ہے۔ یہ ایک ایسا باریک مضمون ہے جس کے سمجھنے میں ذرا سی غلطی کرنے سے انسان بے شمار الجھنوں میں مبتلا ہو سکتا ہے ہاں اس حقیقت کو جاننے کے لئے انتہائی اور زبردست ریاضت کی ضرورت ہے۔ شیخ سیّد عبدالقادر جیلانیؒ اور امام غزالیؒ ہمارے سامنے اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ جنھوں نے رُوحانیت کے اعلیٰ مقام کو طے کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ حضرت سیّد عبدالقادر جیلانیؒ قصیدہ غوثیہ میں فرماتے ہیں ؎

نَظَرْتُ اِلٰی بِلَادِ اللّٰہِ جَمْعًا کَخَرْدَلَۃٍ عَلٰی حُکْمِ اتِّصَالِی

میں نے جب اللہ تعالیٰ کی اس کائنات کو دیکھا تو ساری کائنات رائی کے دانہ کی مانند نظر آئی۔ یعنی دنیا کی حیثیت رائی کے دانہ کے برابر ہے۔

---

[1] آیت ملاحظہ ہو صفحہ ۲۸ پر

بہرحال جو لوگ حقیقت کی راہ میں انتہائی اور زبردست ریاضت کرتے ہیں ان کے سامنے تمام راہیں کشادہ کی جاتی ہیں اور اس طرح وہ قال اور حال کو یکساں طور سامنے دیکھ سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا تعلق اس جماعت سے ہے۔ جو اجتہاد سے کام لیتی ہے اور جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا — جنھوں نے ہمارے راستے میں
لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا — تگ و دو کی اُنکو ضرور بضرور ہم اپنے راستے دکھائیں گے۔
(القرآن)

غرض نفس یا خودی کو پہچاننے کے لئے زبردست ریاضت اور محنت شاقہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ خودی کی تعمیر کے بعد ہی انسان خُدائی کو جان سکتا ہے۔ علامہؒ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

بے ذوق نمودِ زندگی موت
تعمیرِ خودی میں ہے خُدائی

مقامِ خودی

تعمیرِ خودی میں اگر کجی ہو تو انسان حق کی معرفت کے حصول سے محروم رہتا ہے۔ لیکن جب خودی صحیح ہو تو خدائی عنایات اور فضل وکرم انسان کی خاطر مہیّا ہو جاتے ہیں۔ امام غزالیؒ نے خودی کے بارے میں جو باتیں بیان فرمائی ہیں اُنھیں کو مولانا مودودیؒ اپنی علمی بصیرت سے واشگاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آدمی کی خودی جسم اور اس کی طاقتوں پر اچھی طرح قابو یافتہ ہو اور نفس کی خواہشات وجذبات پر اس کی گرفت اتنی مضبوط ہو کہ وہ اس کے فیصلوں کے تابع ہو کر رہے۔ انسان کے وجود میں خودی کا مقام وہی ہے جو ایک سلطنت میں حکمران کا مقام ہوا کرتا ہے۔ جسم اور اس کے اعضاء خودی کے آلہ کار ہیں۔ تمام جسمانی اور دماغی طاقتیں خودی کی خدمت کے لئے ہیں۔ جیسا کہ ابھی آپ نے پڑھا ہے۔ چنانچہ نفس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ خودی کے حضور میں اپنی خواہشات کو درخواست کے طور پیش کرے۔ فیصلہ خودی کے اختیار میں ہے کہ وہ ان آلات اور طاقتوں کو کس مقصد کے لئے استعمال

کرے اور نفس کی گذارشات میں سے کسے قبول اور کسے رد کرے۔

اگر کوئی خودی اتنی کمزور ہو کہ جسم کی مملکت میں اپنا حکم اپنے منشاء کے مطابق نہ چلا سکے اور اس کے لئے نفس کی خواہشات، مطالبات اور احکام کا درجہ رکھتی ہو تو وہ ایک مغلوب اور بے بس خودی ہے۔ اس کی مثال اس سواری کی سی ہے جو اپنے گھوڑے کے قابو میں آگئی ہو۔ علامہ اقبال اسی بات کو سمجھانے کے لئے فرماتے ہیں ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

انسان کو چاہئے کہ وہ نفس کے گھوڑے کو اپنے قابو میں رکھے۔

ہر کہ او را نفسِ توسن رام شد
از خردمندان نیک و نام شد

یعنی جس کسی نے اپنے نفس کے گھوڑے کو خودی کے قابو میں کر دیا تو اُس نے دُنیا کے لوگوں میں اپنا ایک مقام پیدا کر دیا ہے۔ اب رہے وہ لوگ جو نفس کے گھوڑے کے قابو میں آگئے ہیں۔ ایسے کمزور انسان دُنیا میں کسی قسم کی کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتے ہیں۔ تاریخ انسانی میں جن لوگوں نے اپنا کوئی نقش چھوڑا ہے وہ وہی لوگ تھے۔ جنھوں نے اپنے وجود کی طاقتوں کو بزور اپنا محکوم بنا کر رکھا ہے جو خواہشاتِ نفس اور جذبات کے غلام بن کر نہیں بلکہ آقا بن کر رہے ہیں۔ جن کی خودی مضبوط اور پختہ رہی ہے[1]

---

[1] تفہیم القرآن، مشکوٰۃ انوار، کیمیائے سعادت۔

کشمیری زبان کے مایہ ناز شاعر مقبول شاہ کرالہ واری نے مقام خودی کی ترجمانی اپنی مشہور و معروف مثنوی "گلریز" میں ایک اچھے انداز میں کی ہے۔ نفس کی پہچان کے لئے انھوں نے اس وجود کے مختلف پہلوؤں کو مختلف اسماء سے موسوم کر کے مقام خودی سے آشنا کیا ہے۔ جہاں دیگر علماء و فلاسفہ دل، نفس یا روح کو خودی کا نام دیتے ہیں وہیں صاحب گلریز اپنی اس مثنوی میں اس کو عجب ملک یعنی عجب یا بے مثال بادشاہ نام دیتا ہے۔ لبوں کے ذریعے اس کو معرفت سے لبریز کراتا ہے تو اسی کو "نوشِ لب" یعنی ہونٹوں سے حرکت کر کے ہی وہ جوہر بے بہا کو حاصل کر سکتا ہے یا بہ الفاظ دیگر نوش لب (ہونٹوں سے پینے والی) وہ معرفت ہے جس کو حاصل کرنا انسان کی منزلِ مقصود ہے۔ پھر جب یہ دل اِدھر اُدھر غلط راہوں کی طرف مائل ہونے لگتا ہے یا ڈگمگانے لگتا ہے تو اسی حالت میں "راسخ" اس کو اس راہ سے ہٹا کر راہِ حقیقت کی طرف گامزن کرتا ہے۔ مقبول شاہ نے دراصل عقل سلیم کا نام راسخ رکھا ہے۔ قرآن مجید کا حکم ہے وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (صرف وہی لوگ نصیحت حاصل کر سکتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے عقل سلیم عطا کی ہو) وہی لوگ راہِ حقیقت کی طرف گامزن ہوتے ہیں جن کی رہنمائی عقل سلیم کرتی ہے۔ غرض اس مثنوی میں جتنے بھی کردار ہیں وہ سب انسان کی خودی کے عروج سے متعلق کمال و زوال کے حرکات کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ جب خودی کا دوسرا نام عشق ہے تو عاشق کو اپنے معشوق کے حصول کی خاطر نہ جانے کتنے رقیبوں سے جنگ لڑنی پڑتی ہے اور نہ جانے کتنی کٹھن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پھر اس جنگ میں اس کو

کون ساتھ دے رہا ہے، کون نہیں ۔ کامیابی کیسے حاصل ہوتی ہے ۔ اس مثنوی میں ان تمام سوالات پر مختلف پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے ۔ ایسا لگتا ہے کہ صاحب مثنوی مقام خودی سے اچھی طرح آشنا تھے ۔

الغرض جس انسان کی خودی اِلٰہ العالمین کی الٰہیت سے آزاد اور ربّ العالمین کی ربوبیت سے بے نیاز ہو کر جہانِ خاکی کو دائمی سمجھے اور اس دنیا کے رنگ و بو کو ابدی گلستان جان کر قفس کو آشیانہ سمجھ بیٹھے وہ خودی نہیں گمراہی ہے اور ایسی خودی نمرود، فرعون، ہٹلر، مسولنی، وغیرہ جیسے سرکش لوگوں کو ہی جنم دے سکتی ہے ۔

اس سرابِ رنگ و بُو کو گلستاں سمجھا ہے تُو
آہ ! اے نادان قفس کو آشیاں سمجھا ہے تُو

علامہؒ نے خودی کی پہلی شرط جہاں کو دائمی نہیں بلکہ فانی سمجھنے کو قرار دیا ہے اور خودی صرف اللہ تعالیٰ کے مرضی کی پابند ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جہاں تیرے لئے ہے تو جہاں کے لئے نہیں ۔

خودی کی ہے منزل اوّلین | مسافر ! یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں | جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ بھی اسی طرح خودی سے متعلق ایک اور جگہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کامیاب زندگی کے لئے خودی کا قابو یافتہ ہونا تو بہرحال ضروری ہے ۔ مگر جو خودی اپنے خالق سے آزاد اور دُنیا کے مالک سے بے نیاز ہو ۔ جو کسی بالاتر اخلاقی قانون کی پابند نہ ہو ۔ جس کو کسی حساب لینے والے کی بازپرس کا اندیشہ نہ ہو وہ اگر اپنے جسم و نفس کی طاقتوں پر قابو

پاکر ایک پُرزور خودی بن جائے ۔ تو وہ دنیا میں فرعون ، نمرود ، ہٹلر وغیرہ جیسے بڑے بڑے مفسد ہی پیدا کر سکتی ہے ۔ ایسا ضبطِ نفس نہ قابلِ تعریف ہے اور نہ وہ اسلام کو مطلوب ہے ۔ اسلام جس ضبطِ نفس کا قائل ہے وہ یہ ہے کہ پہلے انسان کی خودی اپنے خُدا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے ۔ اس کی رضا کا طلب اور اُس کے قانون کی اطاعت کو اپنا شعار بنالے ۔ اس کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ سمجھ لے پھر اس مسلم و مؤمن خودی کو اپنے جسم اور اس کی طاقتوں پر حاکمانہ اقتدار اور اپنے نفس اور اِس کی خواہشات پر قاہرانہ تسلّط حاصل ہو تا کہ وہ دنیا میں ایک مصلح قوت بن سکے ۔

باب دوم

حقیقتِ عشق

اور

تفہیمِ خودی

دُرِّ ثمین

حاسد اس شخص کے مانند ہے جو اپنے کسی دشمن کو مارنے کے لئے پتھر پھینکے اور پتھر دشمن کو لگنے کے بجائے اس کی داہنی آنکھ پر لگے اور وہ پھوٹ جائے۔ اس سے اس شخص کو اور غصہ آوے اور پھر زور سے پتھر مارے اور اسی طرح اپنی دوسری آنکھ پھوڑلے۔ پھر اور پتھر مارے اور وہ اپنا سر توڑ ڈالے۔ اس طرح وہ اپنے دشمن پر پتھر پھینک پھینک کر اپنے آپ کو مجروح کرے اور اس کا دشمن صحیح سالم رہے اور اس کو دیکھ دیکھ کر ہنستے۔

امام غزالیؒ

حضور سرور کونین ﷺ کے ساتھ ظاہری اور باطنی دونوں طرح رشتہ عہدِ شباب میں ہی قائم کرو یہ تمہاری روشن مستقبل کا ضامن ہے۔

(ابوالسید غلام محمد شاہ قادری)

عشق دمِ جبریلؑ، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسولؐ، عشق خدا کا کلام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

گلا تو گھونٹ دیا، اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

دولت سے نام، کمانا کمال نہیں، غریبی میں نام پیدا کرنا

(ابوالسید غلام محمد شاہ قادری - اوڈورہ)

عشقِ حقیقی

عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق کے سمندر کی گہرائی لامنتہا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کی ابتداء خود ربّ ذُوالجلال نے اپنے معشوق لایزال سے "لولاکَ لَمَا خَلَقتُ الاَفلاک" خطاب فرماتے ہوئے کی ہے۔ یہ عشق ہی ہے جس نے کائنات کو وجود بخشا ہے۔ عشق عمل کا مادّہ پیدا کرتا ہے۔ عشق حقیقی کی انتہا بھی اور ابتداء بھی "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ" ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نام پاک کے ساتھ اپنے محبوب کا نام رکھ کر اپنے عشق کامل کا ثبوت دیا ہے۔ پھر اسی کلمۂ حق سے ساری کائنات کو زینت بخشی

عشق حقیقی اور عشق مجازی کے رُوح پرور مظاہر اس تماشگاہِ عالم میں از آدم تا ایں دم مختلف شکلوں میں سامنے آئے ہیں۔ اگر یہ انسان نہیں تو یہ ماہ و خورشید، زمین و آسمان، دن اور رات پہاڑ اور تارے سب کے سب شاہد اور گواہ ہیں اور آج بھی اپنی گواہی کو زبان حال سے بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عشق حقیقی کی رُوح پرور مثالیں صرف

انبیاء و رُسل علیہم السّلام کی ذاتوں سے ہی منسوب نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو اس سلسلے میں نمایاں اور بلند مقام حاصل ہے ۔ ہم انبیاء علیہم السّلام اور اولیاء اللہ کے عشقِ الٰہی کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں ہم اس عشق کے سمندر کی گہرائی ناپنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں ۔ عشقِ الٰہی کے ساتھ جب عشقِ محمدیؐ بھی ہو پھر ایسا عشق کامل ہو جاتا ہے ۔ اور اسی حالت میں یہ خودی کی آخری منزل طے کر جاتا ہے ۔ عشق کے اس میدان میں بلا تأمل کودنے والے حضورؐ کے اوّلین جانثار صفِ اوّل کے مسلمان سیدنا ابُوبکر صدیقؓ تھے ۔ اُنھوں نے اپنے عشقِ محمدیؐ سے ایک ایسی مثال قائم کر دی ہے جس کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی ۔ اگر ایک طرف عشقِ محمدیؐ کے چمکتے ہوئے ستارے حضرت عمر فاروقؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ ہیں تو دوسری طرف حضرت اُویس قرنیؓ حضرت بلال حبشیؓ، بلال رُومی اور حضرت سلمانِ فارسیؓ کو عشقِ محمدیؐ کے طفیل ہی شہرتِ دوام حاصل ہوئی ۔

ہیں کرنیں اِک ہی مشعل کی، ابُوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ علیؓ
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبیؐ، کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

بعد کے زمانوں میں جہاں مولانا جامیؒ اور مولانا رُومیؒ وغیرہ ہیں، عشقِ محمدیؐ میں فنا ہوئے ں علامہ اقبالؒ نے اس میدان میں خوشی خوشی قدم رکھا اور بہت جلد اپنا ایک مخصوص مقام بنالیا ۔ اس مقام کو اعلیٰ سے اعلیٰ ترین مقام سمجھکر لندن سے اُنھوں نے اپنے لختِ جگر جاوید کو لکھا :

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر

لہلہاتے گلستان کا مہکتا پھول

علامہ اقبالؒ اُس گلستان کے مہکتے پھول تھے جس کو بادِ بہار مصطفیٰؐ نے کھلا دیا تھا۔ وہ ایسے والدین کے چشم و چراغ تھے جو اللہ والے بزرگ تھے۔ اِن کی نیکی اور پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ انھیں سارے شہر میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور وہ لوگوں میں بے انتہا معروف تھے۔ ان کی والدۂ محترمہ امام بی بی خُدا ترس، متوکلہ اور عاشقِ نبیؐ ہونے کے ساتھ ساتھ ہمدردی و شفقت کا ایک گہرا سمندر تھی۔ ایسے ہی والدین کی تربیت کا ثمرہ ہے کہ ان کے چمنستان میں ایک ایسا پھول کھلا جس نے گلستان عالم کو اپنی خوشبو سے مہکا دیا۔ سبحان اللہ! جس ٹہنی کے غنچۂ خنداں کو بادِ بہار مصطفیٰؐ کھلا دے وہ کیوں نہ عالم اسلام کو اپنی خوشبو سے معطّر کرے گا۔ دراصل کردار سازی کی اوّلین جگہ والدین کی آغوش میں ہے۔

؎ سیرتِ فرزندہا از اُمہات
جوہر صدق و صفا از اُمہات

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ کمال درجہ کی بات ہے کہ علامہ اقبالؒ کا شُمار عاشقانِ نبیؐ میں ہوتا ہے اور دوسری طرف اِنھیں شاعرِ قرآن کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ یہ خطاب بذاتِ خود ایک افضل و اعلیٰ

مرتبہ ہے۔ علامہ اقبالؒ اس خطاب پر فخر کرتے تھے۔ واقعی علامہؒ قرآن کریم کی اس آیت کا عملی نمونہ تھے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (القرآن)	اعلان فرما دیجئے یارسول اللہ ﷺ کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو تم میری (محمدؐ کی) پیروی کرو اسطرح اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا

اسی بناء پر علامہؒ خودی کے رازِ پنہاں کو عیاں کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

جب انسان کی خودی کو درجۂ کمال حاصل ہوتا ہے اس کے اندر انسانیت کے سارے اوصاف پائے جانے لگتے ہیں اور انسان اپنے آپ کو پہچان جاتا ہے تو اس کی ساری حرکات و سکنات اللہ کی مرضی کے مطابق انجام پذیر ہوتی ہیں اور وہ اسطرح اللہ تعالیٰ کے ظہور کا مظہر ہو جاتا ہے اور اُس کا سننا اللہ تعالیٰ کا سننا، اس کا بولنا اللہ تعالیٰ کا فرمانا، اُس کا چلنا اللہ تعالیٰ کا چلنا اُس کا غصہ اللہ تعالیٰ کا غصہ، اُس کی شفقت اللہ تعالیٰ کی شفقت اور اس کا اشارہ اللہ تعالیٰ کا اشارہ بن جاتا ہے جس کو علامہؒ اِن لفظوں میں بیان فرماتے ہیں

ے ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کارآفریں کارکشا کارساز

یا دوسرے لفظوں میں خدا کی خدائی اُس کو پکار کر کہنے لگتی ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟ اس نکتہ کو ہم آئندہ صفحات میں بالتفصیل بیان کریں گے۔

عشق کیا ہے؟

حضورؐ رحمتِ عالمؐ سے عشق کا رشتہ باندھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس سمندر میں کودنا ہتھیلی پر انگارے رکھنے کے مترادف ہے۔ حضورؐ سے عشق کرنا اتنا آسان اور سہل نہیں ہے جتنا ہم نے اس کو سمجھ رکھا ہے کہ جب کسی کی زبان سے محمدؐ کا نام سنا تو یکدم انگوٹھے چومنے لگیں اور سر جھکا دیا، میلاد کے جلسوں میں شرکت کرنا اور ذکر ولادت کے وقت تعظیماً کھڑا ہونا یا کسی درگاہ پر ایام معدودات تک کے لئے حاضری دیکر جبین سائی وغیرہ کرنا ہی عشق محمدی میں شامل نہیں ہے، بلکہ عشق رسولؐ اپنے ساتھ بہت سارے تقاضے رکھتا ہے۔ انہی تقاضوں کو پورا کرنے کا نام عشق ہے۔ علامہؒ ان تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام

یہ عشق ہی ہے جس نے ابراہیمؑ کے لئے نمرود کو گلزار میں

تبدیل کر دیا تھا۔ دریائے نیل میں موسیٰؑ کے لئے خشک راہ بنا دی تھی۔ اور یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں عالم غیب کی سیر کرا دی۔ عشق ہی ہے جس نے باپ کو بیٹے کے حلق پر چھری چلانے پر آمادہ کیا اور بیٹے کو اپنے باپ کے ہاتھوں ذبح ہونے کے لئے بیقرار بنا دیا۔ عشق ہی ہے جس نے حضرت بلالؓ کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹنا اور اپنے ننگے جسم اقدس کو گرم گرم لوہے کی سلاخوں کے داغے جانے کو سعادت اور اقبال مندی بنا دیا۔ یہی عشق ہے جس نے حسینؑ کو میدان کربلا کے ریگ زار میں بے سروسامانی کی حالت میں شرف شہادت بخشا۔ معشوقِ ازلی کو خوش رکھنے کے لئے انھیں بزدلی سے نہیں بلکہ بہادری کے ساتھ جانِ عزیز کو جان آفرین کے حوالے کرنا سکھا دیا۔ یہی عشق ہے جس نے حسّان بن ثابتؓ اور کعب بن زہیرؓ کو بے مثل شاعرانہ صلاحیت کی اساس پر دربار نبویؐ سے خلعت اور انعام واکرام سے نوازا۔ غرض داستانِ عشق کی حقیقت ایک ایسی حقیقت ہے کہ اگر پہاڑوں پر اسے رکھا جائے تو بے اختیار ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں اور اگر اسے لوہے پر تحریر کیا جائے تو وہ تپش عشق کے سبب موم کی طرح پگھل جائے۔

ے عشق آتش است کہ دوزخ غذائے اوست

بہر حال یہی عشق ہے جس نے علامہ اقبالؒ کے اندروں کو لاوے کی طرح پگھلا کر انھیں سراپا نیاز بنا دیا۔ عین اسی طرح جس طرح آپ سے سینکڑوں سال قبل جلال الدین رومیؒ کے اندروں کو پگھلا کر متاع گراں مایہ بنا دیا۔ عشق نے ہی علامہ اقبال کو ایک پیامبر شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش کیا۔ اس حقیقت کے پس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ علامہؒ کے

نزدیک معرکۂ کائنات، تماشائے ذات، سکون و ثبات اور حیات و ممات کا محرک صرف عشق ہے۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات

اس عشق کی حقیقت اور اہمیت اُس وقت اور بھی زیادہ عیاں ہو جاتی ہے۔ جب انسان اِس پہلو پر غور کرتا ہے کہ خود حضرت ربّ کائنات جلّ شانہٗ نے اپنے معشوق سرورِ کائناتؐ سے اپنے عشق کا اظہار بار بار کیا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے کلام پاک میں کبھی لعمرک کی تلاوت کر کے اور کبھی طٰہٰ، یٰسین یا مُزّمِل و مُدّثر جیسی سورتوں کی آیاتِ بیّنات پڑھ کر حضورؐ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عشق کا علم حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ خُدائے برحق نے اپنے کلام پاک میں جگہ جگہ اپنے معشوق کی تعریف کر کے آپؐ کی لاثانی شان مزید تابان اور روشن کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے معشوق یعنی سرورِ کائناتؐ کے اخلاق کی تعریف کہیں۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ کہہ کر کی ہے تو کہیں اُن کی شفقت کو عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ اور اُن کے اوصافِ حمیدہ کو بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ اور کہیں اُن کے علوِ مرتبت کو وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ یا وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ کہہ کر واضح کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ربّ کائنات جلّ شانہٗ آپؐ کی دلجوئی و دلداری مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى سے کرتا ہے اور پھر آپؐ کو اوّل و آخر اور ظاہر و باطن کہہ کر اپنے اوصافِ کریمہ سے متّصف فرماتا ہے۔

حضرت جبریلؑ کا آپ سے عشق کا یہ عالم تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے چوبیس ہزار بار آپؐ کے پاس آکر بھی وہ آپؐ کے پاس بار بار آنے کی تمنا رکھتے تھے۔ حالانکہ گذشتہ پیغمبروں کے یہاں حضرت جبریلؑ کا آنا بہت ہی کم تھا۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کے پاس وہ بارہ دفعہ، حضرت ادریسؑ کے پاس چار دفعہ، حضرت نوحؑ کے پاس پچاس دفعہ، حضرت ابراہیمؑ کے پاس بیالیس دفعہ، حضرت موسیٰ کے پاس چار سو دفعہ اور حضرت عیسیٰؑ کے پاس تیرہ دفعہ آئے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک عشق کا حقیقی مفہوم درج ذیل شعر میں نہاں ہے۔

؎ عشق دم جبریلؑ، عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسولؐ، عشق خدا کا کلام

سچ ہے کہ مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا فَاَکْثَرَ ذِکْرَہٗ یعنی جو شخص جس سے محبت کرتا ہے اکثر اس کا ذکر کرتا ہے۔ عشق رسولؐ سے بڑھکر انسان کے لئے اور کون سی چیز ہو سکتی ہے۔ خدا کی معرفت اور خوشنودی اس عشق رسولؐ پر منحصر ہے۔ دراصل آفرینش کائنات کی وجہ اور انسانی حیات کا مقصد عشق نبیؐ کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

اقبال ـــــ ایک عاشق رسولؐ

حضرت علامہؒ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ ایک بلند پایۂ فلسفی ہوتے ہوئے بھی اکثر فلسفیوں کی طرح تشکیک والحاد کی طرف مائل ہونے کی بجائے ایسے گرویدہ اسلام اور عاشق رسولؐ تھے کہ انھوں نے اپنے تمام تر فلسفے کو ایک متاع حقیر کی طرح حضور سرورکائناتؐ کے قدموں پر نچھاور کیا ۔ ایسا کرنے سے علامہؒ کی حیثیت یہ ہوئی کہ آپؒ کتاب سے نہیں بلکہ کتاب آپؒ کی ذات سے درجہ حاصل کرتی ہے ۔ کتاب سے یہاں ہماری مراد علم ہے ۔ علامہؒ کا ارشاد ہے ؎

علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُمّ الکتاب

حکیم محمد حسن قُریشی فرماتے ہیں :

اِس شیفتگی اور عشق کا اندازہ مشکل ہے جو اُن کو اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تھا ۔ حضور سے بیحد احترام کرتے تھے اور جدید تعلیم یافتہ مسلمان " محمدؐ صاحب کتاب" کہتا تو بہت تکلیف محسوس کرتے (اقبال نامہ، ص: ۵۲)

جوانوں کو جب مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے پاتے تو بہت افسوس کرتے۔ ایک واقعہ ہے کہ:

"زندگی کے ایّام آخر میں کچھ لوگ اُن سے ملنے گئے۔ تو کیا دیکھا کہ ان کی طبیعت بہت بے چین ہے۔ چشم پُرنم، آنکھوں میں آنسوں ڈبڈبائے ہوئے ہیں۔ پوچھا خیر ہے۔ جواباً فرماتے ہیں۔ آج ایک نوجوان مسلمان مجھ سے ملنے آیا تھا مجھے سخت افسوس ہوا کہ جس قوم کے نوجوانوں کا یہ حال ہو اس کا انجام کیا ہوگا! کئی ایّام تک اس واقعہ کا اثر ان کے دل پر رہا"

(حیاتِ اقبال، ص: ۱۱۵)

علّامہؒ کو ہمیشہ جوانوں کی خستگی اور زبون حالی پر رحم آتا تھا۔ اُن کی بھلائی اور فلاح و بہبود کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ ہمیشہ ان کی ترقی کے خواہاں اور ہمیشہ سبیل الرّشاد کی طرف ان کو گامزن کرنے کے متمنّی رہے۔ ساقی نامہ میں اللہ سے درخواست کرتے ہیں کہ اے اللہ! عقل کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کر اور جوانوں کو پیروں کے درس سے آگاہ کر اور پھر میرے کلام کے ذریعہ اُن کے دلوں میں عشقِ رسولؐ کا جذبہ پیدا کر کیونکہ یہی نوجوان معمارِ قوم ہیں۔

خرد کو غلامی سے آزاد کر　　جوانوں کو پیروں کا استاد کر

جوانوں کو سوز جگر بخش دے　　میرا عشق میری نظر بخش دے

علّامہ اقبالؒ عشق رسولؐ میں غرق تھے۔ مولانا سالک فرماتے ہیں:

"اُن کے گداز قلب اور رقت احساس کا یہ عالم تھا کہ جہاں ذرا حضور سرورِ کون و مکان صلی اللہ علیہ وسلم کی رأفت و رحمت، یا حضورؐ کی سروری کائنات کا ذکر آتا تو حضرت علامہؒ کی آنکھیں بے اختیار اشک بار ہو جائیں اور دیر تک طبیعت نہ سنبھلی۔ (اقبال نامہ)

وہ سادگی، عاجزی اور انکساری کا مجسمہ تھے۔ کبھی بھی اپنی رفعت و تکریم پر ناز نہ کرتے تھے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ صدقۂ محمدیؐ جان کر فخر کرتے تھے۔ اپنی متاعِ حیات کو حضورؐ کے قدموں پر نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ سامانِ عیش و تنعّم کو حقارت سے ٹھکراتے تھے۔

مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں:

"پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لئے اقبالؒ اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون دان اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں اُن کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبالؒ اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لئے گئے تو ہر طرف عیش و تنعّم کے سامان دیکھکر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پاکر معاً اُن کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاکؐ کی جوتیوں کے صدقے آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں اُس نے بورئے پر سو کر زندگی گذار دی تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ ایسے بستر پر لیٹنا اُن کے لئے ناممکن ہوگیا۔ اُٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جاکر ایک کرسی پر بیٹھ گئے

اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اسی غسل خانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے، غسل خانے ہی میں سوتے رہے۔ یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے۔"

(جواہر اقبالؒ، ص: ۳۹)

اس عالم فانی کی زندگی کے آخری ایّام میں جب مولانا اسلم جیراجپوری اُن سے ملنے گئے تو وہ فرماتے ہیں کہ علّامہؒ کے ساتھ دیر تک میرا سلسلہ گفتگو جاری رہا۔ چنانچہ اُس سال وہ حج کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن کمزوری اور بیماری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھی سے باہر نکلنا بھی مشکل تھا۔ کہتے تھے کہ میں دو سال سے ارادتاً سفرِ حج میں ہوں بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں جو سفر سے متعلق ہیں۔ اِن میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی۔ اُنھوں نے مکّہ سے مدینہ کی طرف روانگی کے وقت ایک غزل لکھی تھی۔ جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

تو باش اینجا و با خاصان پیامیز
کہ من دارم ہوائے کوچۂ دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہوا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر موضوعِ سخن بدلنا پڑا۔"

(آثارِ اقبالؒ، ص: ۹۰)

اس طرح کے کتنے واقعات ہیں جو علّامہؒ کے عشقِ نبیؐ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان تمام واقعات کا اس کتابچہ میں احاطہ کرنا از بس کہ ناممکن ہے۔ پھر بھی ہم ایک اور ایسے ہی واقعہ کا ذکر کرنا پسند کریں گے۔ اس ضمن میں میر غلام بھیک نیرنگ اپنی رائے کا اظہار

کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اقبالؒ کا عشقِ نبیؐ اس درجہ کا تھا کہ اگر وہ حضورؐ کے روضۂ مبارک پر پہنچ جاتے تو وہیں شہید ہو جاتے ۔ فرماتے ہیں :

" اقبالؒ کا قلبی تعلق حضور سرورِ کائناتؐ کی ذات قدسی صفات سے اس قدر نازک تھا کہ حضورؐ کا ذکر آتے ہی اُن کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی، اگرچہ وہ فوراً ضبط کر لیتے تھے۔ چونکہ میں کئی بار اُن کی یہ کیفیت دیکھ چکا تھا ۔ اس لئے میں نے اُن کے سامنے نہیں کہا ۔ مگر خاص لوگوں سے بطور راز ضرور کہا کہ یہ اگر حضورؐ کے مرقد مبارک پر حاضر ہونگے تو زندہ واپس نہ آئیں گے، وہیں جان بحق ہو جائیں گے ۔ میرا اندازہ یہی تھا ۔ اللہ بہتر جانتا ہے ۔"

(اقبالؒ : ماہِ اکتوبر ۱۹۵۷ء، ص : ۳۲)

اُن کے عشقِ نبیؐ کی انتہا کا اندازہ درج ذیل شعر سے بخوبی ہوتا ہے۔

؎ نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآن وہی فرقان وہی یٰسین وہی طٰہٰ

ان تمام حقائق کے علاوہ علامہ اقبالؒ سکون قلب کے لئے نعتِ رسولؐ کو نسخۂ کیمیا جانتے تھے ۔ بنا بریں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر اپنے دل کو سماعت مدحُ النبیؐ سے سرور بخش کر حضورؐ کے دربارِ عالی میں گریہ زاری کرتے نظر آتے ہیں ۔ جلال الدین صاحب بیرسٹر فرماتے ہیں کہ میرے پاس ایک خوش لحن اور شائستہ مذاق لڑکا ملازم تھا ۔ جس کو ستار بجانے میں کمال دسترس حاصل تھا ۔ مسدس حالیؔ ستار پر ایک خاص طرز سے بجایا کرتا تھا ۔ ڈاکٹر اقبالؒ مسدس حالیؔ کے بڑے عاشق تھے ۔ اور التزام

کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے روز اُن سے سنا کرتے تھے۔

مُسدّس کے چند مصرعے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مُرادیں غریبوں کی بَر لانے والا
مُصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا مأوٰی
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولا الخ

اور پھر اس کے آخری چند دُعائیہ مصرعے یہاں درج کرتا ہوں۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے
اُمّت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں آج وہ غریبُ الغربا ہے
جس دین نے غیروں کے تھے دل آکے ملائے
اُس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے
گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پَر نام تیری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے
ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدّت سے اسے دورِ زمان مٹ رہا ہے

آخری اشعار سنکر علامہ زار زار رویا کرتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ حضور رحمۃ للعالمینؐ کے حضور میں ہیں۔

آخر ان کے اس درجہ عشق رسولؐ اور فکر امت رسولؐ کے اصل محرکات کیا ہیں؟ اس حقیقت کے بارے میں مکمل طور پر نہ سہی پھر بھی اسے کسی قدر جاننا بہت ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علماء محققین کی ایک بڑی تعداد نے ان کی زندگی کے جملہ پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں لوگوں نے مختلف رائیں پیش کی ہیں۔ ان تمام رایوں کو یہاں بیان کرنا چونکہ ناممکن ہے اسلئے میں مختصر اشاروں پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

والدین کی تربیت کا نتیجہ

معزز قارئین ! آپ بخوبی واقف ہونگے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ کے حصول کے لئے اصلی بنیاد ہمیشہ تربیتِ والدین کو ہی قرار دیا جاتا ہے۔ پھر تائیدِ ایزدی کا اس میں شامل ہونا بھی بہت ضروری ہے اور بغیر سعی اعلیٰ مرتبہ کا حصول ناممکن ہے۔ سعی اور کوشش کامیابی کی اوّلین شرط ہے۔ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ " کُلُّ مَوْلُوْدٍ عَلٰی فِطْرَۃِ الْاِسْلَامِ یعنی ہر پیدا ہونے والا فطرت اسلام پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد والدین چاہے اس کو یہودی، نصرانی، صالح، طالح، نیک و بد، بدکار و پرہیزگار وغیرہ بنا دیں۔ اقبالؒ کا خودشناس اور عاشقِ رسولؐ ہونا درحقیقت نیک و صالح والدین کی تربیت کا ہی نتیجہ ہے۔ علامہ کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ اُنھوں نے ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا جو علم و ادب کا گہوارہ اگرچہ نہیں تھا پھر بھی ان کا دلدادہ ضرور تھا۔ یہ گھرانہ عشقِ رسولؐ اور معرفت قرآن سے لبریز تھا۔ یہی وہ بنیادی وجہ تھی کہ اقبالؒ بعد کے ایام میں حضورؐ کے گرویدہ اور قرآن حکیم کے فدوی

بنے اور کیوں نہ بنتے ؛ آپؒ ایسے مردِ صالح کے چشم و چراغ تھے جو بزرگوں کی صحبت میں بیٹھتا تھا ۔ اور دین کی باتوں کو سننے کا مشتاق تھا ۔ اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کی محبت اور عشق ان کی رگ رگ میں پیوستہ تھا ۔ مولانا رومؒ کا عاشق اور ان کی مثنوی کے اشعار کو بڑے شوق اور لطف سے پڑھا کرتا تھا ۔ تصوّف سے اسے گہری دلچسپی تھی ۔ چنانچہ وہ روزمرّہ زندگی کے فرائض سے دستبردار ہو کر گوشہ نشین ہو جاتا تھا ۔ وہ دل بہ یار اور دست بکار کے عامل تھے ۔ مذہب کا رنگ اُنکی زندگی پر اتنا غالب تھا کہ "حیاتِ اقبالؒ" کے مصنّف نے لکھا ہے کہ اقبالؒ حصولِ تعلیم کی غرض سے ابھی چوتھی جماعت کے طالب علم ہی تھے کہ ایک روز صُبح سویرے اُن کے والد صاحب مرحوم میر حسن کے پاس چلے گئے اور کہا کہ آخر اقبالؒ انگریزی تعلیم پا کر کیا کرے گا ؟ کیوں نہ اقبالؒ کو قرآنی تعلیم سے آراستہ کریں تاکہ اُس کی عاقبت سُدھر جائے اور دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو جائے ۔ میرے خیال میں یہی اچھا ہے کہ اقبالؒ سکول کے بجائے مسجد میں آکر دینیات کی تعلیم حاصل کریں ۔"

والدین کی یہ آرزو آخر کار بار آور ہوئی اور کیوں نہ بار آور ہوتی ؛ اقبالؒ کو قدم قدم پر اپنے نیک والدین کی رہنمائی حاصل تھی ۔ اُن کے قدم اگر کہیں اِدھر اُدھر ڈگمگاتے تو اسی دم اُن کے والدین اُنھیں ٹوک دیتے تھے ۔ خود علّامہ اقبالؒ رموزِ بے خودی میں اس بات کی شہادت دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

"ایک دن جب میں جوانی کے نشے میں تھا ۔ ہمارے
گھر کے چوکھٹ پر ایک گدائے متبرم آیا ۔ غصّے میں آکر میں نے

اُس کے سر پر لکڑی ماری۔ اس صدمے سے اُس نے جو کچھ کہیں سے مانگ کر لایا تھا وہ بھی گر پڑا۔ جوانی کے جوش میں ثواب و ناثواب کو میں نہ سمجھا۔ پر میرے اس فعل سے میرے والد کو کافی رنج ہوا۔ چہرہ افسردہ ہو گیا۔ کانپنے لگے۔ دل سے آہیں نکلنے لگیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں جاری ہونے لگیں۔ یہ دیکھ کر میرا دل لرزنے لگا۔ اور میں کانپ گیا۔ فرمانے لگے۔ بیٹے کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہو؟ قیامت کے روز جب میرا آقا حضور رحمۃ للعالمینؐ کے سامنے ان کی اُمّت کے غازیانِ ملّت، حافظانِ حکمت دین، شُہداء، زُہاد، عاشقانِ دلنگار، عالم، جاہل، شرمسار اور گنہگار سب کے سب موجود ہونگے اور آپ کے گرد جمع ہونگے تو اُس بڑے اجتماعِ اُمّت میں اُس نالہ و فغان کو یاد کر جو یہ گدائے دردمند بلند کرے گا۔ تو اے بیٹے! اُس وقت جب حضورؐ مجھ سے پوچھیں گے کہ اے اللہ کے بندے! اللہ نے تجھے ایک نوجوان اولاد دی تھی تو اُس کو بھی آدمی اور مسلمان نہ بنا سکا۔ بتا! بیٹے! میں اس وقت کیا جواب دوں گا۔"

باپ کی اس حکیمانہ نصیحت کو آپ اس طرح بیان کرتے ہیں:

ع

اند کے اندیش یاد آور پسر
اجتماعِ اُمّت خیرا بشر

باز ایں ریش سفید نگر | لرزہ بیم و اُمید من نگر
بر پدر ایں جور نازیبا مکن | پیش مولا بندہ مولا رسوا مکن
غنچہ از شاخسار مصطفیٰ | گل شو از باد بہار مصطفیٰ

(ترجمہ)

"اے بیٹے! ذرا اُمّت خیر البشرؐ کے اس اجتماع کا خیال کر اور پھر میری سفید داڑھی اور اس پر اُمید و بیم کی وجہ سے جسم لرزاں کو دیکھ۔ باپ پر ایسا نازیبا ظلم روا نہ رکھ اور غلاموں کو آقاؐ کے سامنے رسوا نہ کر۔ تو شاخِ مصطفیٰ کا ایک غنچہ ہے، لہٰذا مصطفیٰؐ ہی کے بادِ بہار سے پھول بننے کی کوشش کر۔"

(رموز بے خودی)

معلوم ہوا کہ معمولی سی غلطی بھی جہاں علامہ کی ابتدائی نشو و نما کے دوران ہو جاتی وہیں آپ کے نیک والدین آپ کو حکیمانہ اور عالمانہ انداز میں نصیحت فرماتے تھے اور انھیں صراط مستقیم سے ذرا بھی منحرف نہ ہونے دیتے تھے۔ اقبالؒ کو یہ رہنمائی اور تربیت دونوں میدانوں میں حاصل رہی۔ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

قرآنِ مجید کے ساتھ شغف

"جب میں سیالکوٹ میں دورانِ تعلیم ایک روز حسبِ عادت صبح کے وقت قرآن کی تلاوت کرتا تھا، میرے والد بزرگوار اپنے اوراد و وظائف سے فراغت پا کر میرے پاس سے گذرے اور مجھے قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے

دیکھکر فرمایا کہ بیٹا! اگر کبھی فرصت ملی تو ایک بات بتادوں گا۔ آخر ایک مدت کے بعد جبکہ میں حسبِ معمول قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا، میرے نزدیک آکر انھوں نے فرمایا۔ بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب قرآن مجید پڑھو تو جان لو کہ یہ قرآن کریم تم پر ہی اُتر رہا ہے یعنی خُدا خود تم سے ہمکلام ہو رہا ہے

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کُشا ہے، نہ رازیؒ نہ صاحب کشّاف
(اقبالؒ)

اب اقبالؒ قرآنِ حکیم کو اس طرح سمجھنے لگے جیسے کہ وہ قرآن کی اس آیت کے ترجمان ہوں۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا۔ (القرآن)

کیا وہ قرآن کے بارے میں تفکر و تدبر سے کام نہیں لیتے ہیں یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔

جب انسان قرآن مجید پر غور و خوض کرنے لگتا ہے تو اس کا سارا حال بدل جاتا ہے۔ وہ نیست سے ہست ہو جاتا ہے۔ اسفل سے افضل، ادنیٰ سے اعلیٰ اور ساریاں سے جہاں یاں ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ کو قرآن سے ایسا شغف تھا کہ دن رات قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور اس کے رموز جاننے کی فکر میں لگے رہتے۔

میرے خاندان کے ایک بزرگ جو میرے چچا لگتے تھے، ایک روز جب اقبالؒ سے متعلق اُن کے سامنے بات چھڑ گئی، میں اس وقت چھوٹا تھا تو میں نے اُن سے اقبالؒ کے متعلق کئی اہم باتیں معلوم کیں۔ اُنھوں نے

مجھے بتلایا کہ "جب میں اُنکے گھر میں بحیثیت ملازم کام کرتا تھا تو میں نے برابر چھ ماہ تک اقبالؒ کو قرآن کا گہرا مطالعہ کرتے ہوئے پایا۔ مدت مذکورہ کے بعد جب ان کے والد صاحب نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ بیٹا! کہاں تک قرآن مجید کو پڑھا اور سمجھا۔ جواباً علامہ عرض کرنے لگے۔ ابّا جان! کس کی عمر اتنی دراز ہے جو تمام قرآنِ حکیم کا صحیح اور حقیقی مطالعہ کر سکے۔ ہاں! ابّا جان! میں نے تو صرف اس مدت میں قرآن حکیم کی پہلی سورۃ شریف یعنی سورۃ الفاتحہ جس کو "اُمّ الکتاب" بھی کہا جاتا ہے کو پڑھا اور سمجھا ہے۔" اقبالؒ کی ساری شاعری اسی سورہ شریف کی تفسیر نظر آتی ہے۔

حقیقت ہے کہ قرآنِ حکیم وہ کتاب عظیم ہے جس نے ایک انسان کی تقدیر کو بدل ڈالا۔ اسے عالم نیست سے عالمِ ہست میں کر دیا۔ اسے ظلمات سے نکال کر نور کی طرف گامزن کیا۔ رہزن کو رہبر بنا دیا۔ خاکساز کو جہاں ساز بنا دیا، بُت پرست اور باطل پرست کو حق پرست بنا دیا۔ غافل و خفتہ کو بیدار کر دیا۔ نیز کمزور کو طاقتور بنا دیا۔ بے پَر کو پَر عطا کئے۔ غرض قرآن نے انسان کی کایا پلٹ دی۔ اس دُنیا میں ایک انقلاب لیکن حقیقی اور سچّا انقلاب برپا کر دیا۔ یہ قرآن کا ہی معجزہ تھا کہ جو تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے حق کو مٹانے جا رہا تھا وہی کلمہ حق کو بلند کرنے اور باطل کو مٹانے والا بن گیا اور حق کی آواز کو زندہ و جاوید بنا دیا اور پھر فاروقِ اعظمؓ کے لقب سے نوازا گیا۔

علامہ اور عظمت قرآن

کسی شخص کا دعویٰ ہے کہ اسلام تب تک بالکل غلط ہے جبتک کہ مسلمان قرآن سے اپنا رشتہ مکمل طور نہ جوڑے۔ جنھوں نے یہ رشتہ حق و ایمان کی اساس پر قرآن سے جوڑا، وہ بامِ عروج پر پہنچ گئے، اور عزّت و تکریم کے آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے اور ان کا نام عزت کے ساتھ ہر ذی شعور انسان زبان پر لاتا ہے۔ اقبالؒ بھی اس آسمان کے تاروں میں ایک ایسا چمکتا ہوا تارا تھے۔ جس کی تابانیوں نے دُنیا کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ وہ قرآن کی اہمیّت اور عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

گر تو مے خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

اقبالؒ قرآن کو مسلمانوں کا آئین اور اس کی عزّت و تمکنّت کا راز قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست؟ | زیر گردوں سرِ تمکین تو چیست؟
آں کتاب زندگی قرآن حکیم | حکمت او لایزال است قدیم
نسخۂ اسرار تکوینِ حیات | بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرف او را ریب نے تبدیل نے | آیۂ اش شرمندۂ تاویل نے

پختہ تر سودائے خام از زور او — در فتد با سنگ جام از زور او

مے برد پابند و آزاد آورد — صید بنداں را بہ فریاد آورد

نوع انساں را پیام آخریں — حامل او رَحمۃً لِلعالمین ؐ

رہزناں از حفظ او رہبر شدند — از کتابے صاحب دفتر شدند

دشت پیمایاں از تاب یک چراغ — صد تجلّی از علوم اندر دماغ

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

نقش قرآں تا دریں عالم نشست — نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

مثل حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں — زندہ و پایندہ و گویا ست ایں

اندر او تقدیر ہائے غرب و شرق — سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق

(ترجمہ)

تو جانتا ہے کہ اس آسمان کے نیچے تیرا آئین تیری عزت کا راز کیا ہے؟ وہ ہے یہ زندہ کتاب جو قرآن حکیم ہے جس کی حکمت لازوال اور قدیم ہے جو حیات انسان کے لئے نسخۂ اسرار ہے۔ جس کی قوّت سے ناپائیدار پائیدار ہو جاتا ہے، جس کا حرف شک اور تبدیلی سے محفوظ ہے، جس کے آیات شرمندہ تاویل نہیں ہیں۔ جس کے زور سے جام پتھر سے لڑ جاتا ہے۔ غلام اس کے پاس آکر آزاد ہو جاتے ہیں۔ ظالم نادان ہیں۔ نوع انسان کے لئے خدا کا آخری پیغام ہے۔ جس کے حامل رحمۃً للعالمین ؐ ہیں۔

جس کی بدولت رہزن رہبر بن گئے۔ اور وحشیوں نے اس ایک چراغ کی روشنی سے عوام کی سینکڑوں تجلی اپنے دماغ میں بھر لی۔ قرآن مجید کیا ہے؟ خواجہ کے لئے پیام مرگ اور بندہ بے نوا کا دستگیر۔ جب اس کا نقش اس عالم میں قائم ہوا تو کاہن و پایا کے نقوش باطل ہو گئے۔ جو دل میں ہے میں اسے برملا کہتا ہوں۔ یہ کتاب نہیں ہے، اور ہی کچھ چیز ہے، دل میں اترتا ہے تو دل کی حالت بدل جاتی ہے جہاں دل بدل جاتا ہے تو جہاں بھی بدل جاتا ہے۔ یہ خدا کی طرح عیاں بھی ہے اور نہاں بھی ہے۔ زندہ اور پائندہ ناقابل فنا ہے۔ اس میں مغرب کی تقدیر پوشیدہ ہے اور مشرق کی بھی اور یہ کتاب انسان کے خیال میں برق کی سرعت پیدا کرتی ہے۔ (اقبالؒ)

اس طرح علامہؒ نے قرآن کے رموز کو بیان کر کے قرآن کی عظمت سے عوام الناس کو آشنا کیا۔ علامہ کے یہ وہ ابتدائی حالات تھے جنھوں نے اُن کو محمد عربیؐ اور اسلام کا گرویدہ بنا کر بام عروج تک پہنچا دیا۔

اعترافِ تربیتِ والدین

اقبالؒ کے اس قابل رشک تربیت میں جہاں ان کے والد نے اپنا حق ادا کیا وہاں ان کی والدہ محترمہ بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں تھیں۔ وہ انتہائی نیک اور دیندار خاتون تھیں علامہؒ نے ان کی یاد میں جو نظم لکھی ہے، اُس میں فرماتے ہیں:۔

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر میرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفتر ہستی میں تھی ذریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دُنیا کا سبق تیری حیات

ماں باپ دونوں کی تربیت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :

پھر آرکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنھوں نے محبّت کا رازداں مجھکو

اُمّت کے معزز بیٹو اور بہنو ! یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ بچّے کی عزّت کا راز ماں کی گود ہے ۔ ماں بچّے کی اوّلین درسگاہ ہے ماں بچّے کے عروج و زوال اور ترقّی و تنزّل کی ضامن ہے ۔ سماج کے سدھار میں عورت کا ایک اہم مقام ہے ۔ مردوں کے مقابلے میں عورتوں پر کچھ کم ذمّہ داریاں نہیں ہیں ۔ اسلام میں عورت کو اپنا ایک منفرد مقام حاصل ہے ۔ عورت ہی ہے جس نے پیغمبروں، ریشیوں، منیوں اور ولیوں کو جنم دیا ہے ۔ یہ عورت ہی ہے جس کے سوز و ساز سے زندگی کا سوز دروں ہے ۔ اور اسی کے وجود سے تصویر کائنات میں رنگ ہے ۔ حضرت اسماعیلؑ اور حضرت حُسینؑ جیسے فرمانبردار بیٹوں کو جنم دینے والی ماں عورت ہی ہے ۔ الغرض اقبال کے ستارکو بلند کرنے میں ان کے والدین کا اوّلین اور بنیادی حصّہ ہے ۔ کیونکہ انھوں نے

ہی آپؒ کو ابتدائے عمر میں عشق نبیؐ کا راز دان بنایا۔

حضورؐ کا صدقہ

آپؒ کے دل میں عشق نبیؐ کی چنگاری بہت جلد شعلہ بن کر سارے عالم کو منور کر دیتی ہے اور آپؒ عظیم بلندیوں کو سر کر لیتے ہیں۔ آپؒ کی ساری شاعری اسی عشق کا ثمرہ ہے۔ اس عشق کو سب سے بہترین دولت اور سرمایہ حیات جان کر آپ اپنے لختِ جگر جاوید کو غوطہ زن ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ لندن سے ان کو ہدایت کرتے ہیں۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
میرا طریق امیری نہیں غریبی ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

آگے فرماتے ہیں کہ میں نے وہ ہائے ہوئے عشق سیکھ لی ہے جو پتھر سے چشمہ جاری کرتی ہے۔ سنگ دل بھی میرے کلام کی تاثیر سے پگھل جاتا ہے۔ یہ سب کچھ رحمتِ عالمؐ کے دربار کا صدقہ ہے۔ عشق کو سرمایۂ حیات جانکر وہ اپنے دل کی آرزو ظاہر کرتے ہوئے دربارِ نبویؐ میں عرض کرتے ہیں کہ جاوید کو بھی اللہ تعالیٰ حضورؐ کی عشق سے سیراب کر دے۔ فرماتے ہیں:

زشوق آمو ختم آں ہائے و ہوئے — کہ از سنگے کشاید آبجوئے
ہمیں یک آرزو دارم کہ جاوید — زعشق تو بگرید رنگ و بوئے

(اقبالؒ)

جب علامہ اس بحرِ بے کنارے میں بالکل غرق ہو گئے تب کہیں جاکر اُنھوں نے فلسفہ پر، خواہ وہ خودی کا فلسفہ ہو یا تصوّف و روحانیت کا فلسفہ، ایمان و ایقان کا فلسفہ ہو یا حیات و ممات کا فلسفہ۔ الغرض ہر طرح کے فلسفہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس لئے آج آپؒ کے علم و فضل کا ڈنکا شرق و غرب اور جنوب و شمال سارے عالم میں بج رہا ہے۔ ہم اقبالؒ سے جب پوچھتے ہیں کہ آخر انکے علم و فضل کا راز کیا ہے تو جواب میں وہ فرماتے ہیں:

نیم و رنگ از دم بادے نہ جوئیم
ز فیض آفتاب تو برویم

نگاہم از مہ و پروین بلند است
سخن را بر مزاج کس نہ گویم

میں موج ہوا سے آب و رنگ حاصل نہیں کرتا ہوں۔ یعنی میں اپنے حصول کمال کی خاطر دنیاوی کمال کا طلبگار نہیں ہوں۔ میری نگاہ ماہ و پروین سے بلند و بالا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ میں حضورؐ کے آفتاب فیض سے نمو پاتا ہوں اور اسی کا طلبگار ہوں۔ میرے اشعار فرمائشی اشعار نہیں ہیں۔ میں نے کسی کے مزاج کو سامنے رکھکر اشعار نہیں کہے ہیں۔ کوئی خوش ہو یا ناخوش، میں نے تو اپنے اشعار کے ذریعے صرف حق بات کہی ہے۔

مذکورہ بالا طویل بحث محض اس لئے ہے تاکہ ہم اقبالؒ کے "نظریہ خودی" کے مآخذ کو بآسانی جان لیں۔ قارئین کرام سے میری یہی

گذارش ہے کہ وہ اس کتاب کا بہ نظر تأمل مطالعہ کریں۔ اقبالؒ اور عشق رسولؐ پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور آئندہ بھی لکھی جائیں گی۔ ہم نے یہاں اس سلسلے کی سابقہ چند کتابوں سے بعض نکات کو اخذ کیا ہے۔ اور پھر انھیں آپ کی سہولیت کے لئے زیرِ نظر کتاب میں درج کر دیا ہے۔ اِن نکات سے ہمارا مقصد جہاں اقبالؒ کے کمال مرتبت کی اساس کو جانتا ہے، وہیں اُنکے "نظریہ خودی" کے رموز سے بھی واقفیت بہم پہنچانا ہے۔

اِقبال حضورؐ کے حضور میں

"نظریہ خودی" کی صرف ابتدا ہی نہیں بلکہ اقبالؒ کے علوم و معارف کی بنیاد درحقیقت عشق رسولؐ ہے۔ چنانچہ علامہ حضورؐ کے دربار میں عرض کرتے ہیں کہ اے نبی دوجہاں! یہ جو کچھ بھی ملا ہے، وہ آپؐ ہی کی کاسۂ گدائی کا نتیجہ ہے۔

بہ چشمِ من نگر آوردۂ تست — فروغِ لا اِلٰہ آوردۂ تست
دو چارم کن بہ صبحِ مَن رَآنی — شبنم را تابِ مہ آوردۂ تست

میری آنکھوں میں آپؐ ہی کی عطا کردہ روشنی ہے۔ یعنی یہ ایمانی بصیرت آپؐ ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ دربارِ رسولِ رحمتؐ میں عرض کرتے ہیں کہ اے حضور پُر نورؐ آپ نے میری رات کو فروغ ماہ سے روشن کیا ہے۔ میری رات (لاعلمی) کو اپنے بے پایاں فیض رحمت سے آپؐ نے ہی منور کیا ہے۔ آپؐ ہی کی وجہ سے مجھے اتنا کمال حاصل ہو گیا ہے۔ اب جب ایسا کچھ ہو چکا ہے تو عرض ہے کہ آپ (دو چارم کن بہ صبحِ مَن رَآنی) مجھے بھی صبحِ مَن رَآنی کا جلوہ دکھا دیجئے۔ یعنی جب رات کے بعد صبح

نمودار ہو چکی ہے اور حقیقت سامنے آچکی ہے تو مجھے اس حقیقت سے آگاہ کریں نیز میری ان مشتاق نگاہوں کو اپنے دیدار سے منوّر فرمادیں۔ الغرض! علاّمہ کی نگاہ میں انکی ساری کامیابی اور کامرانی "لَولاکَ لَمَّا خَلَقتُ الاَفلاک" والے پیغمبر کی گدائی کا انعام ہے۔ آپ جناب رحمتِ عالمؐ کے دربار میں کمال عاجزی اور انکساری کے ساتھ یوں عرض گذار ہوتے ہیں۔

فقیرم از تو خواہم آنچہ خواہم | دل کوہے خراش از برگ کاہم
مرا درس حکیما درد سر داد | کہ من پروردۂ فیض نگاہم

(ترجمہ)

اے سیّد العرب والعجمؐ! میں آپ کے دربار میں فقیر ہوں، گدا ہوں۔ اور جو کچھ مانگتا ہوں، آپؐ سے ہی مانگتا ہوں۔ میرے برگ کاہ (گھاس کے تنکے) سے پہاڑ کے دل کو زخمی کر دیجئے۔ یعنی میرے معمولی اشعار میں وہ تاثیر بھر دیجئے کہ ان سے سخت سے سخت دل بھی پگھل جائے۔ فلسفیوں کی تعلیم میرے لئے دردِ سر کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ میں آپ کی نگاہ کے فیض کا پروردہ ہوں

(یہاں اقبالؒ اپنی خاندانی خصوصیت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں)

یہ شعر مذکورہ بالا باتوں کے سلسلے میں سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے کہ اقبالؒ کو جو اس درجہ شہرت حاصل ہوئی ہے اور وہ بامِ عروج پر پہنچ گئے تو ان سب باتوں کے پس پردہ نبی اکرمؐ سے انکے والہانہ عشق کا ہاتھ تھا۔ چنانچہ آپؒ عاشقِ رسولؐ

ہی نہیں تھے بلکہ آپ انکی نگاہ کے پروردہ بھی تھے ۔ بہرحال انکی دُعا قبول ہوئی اور آپ کو علم اپنی اتم صورت میں حاصل ہوگیا ۔ فرماتے ہیں :

؎ چوں خود را درکنار خود کشیدم
بہ نُور تو مقام خویش دیدم
دراں دیرا زنوائے صبح گاہی
جہاں عشق و مستی آفریدم

جب میں نے خود کو ہر طرف سے سمیٹ کر معرفت نفس کی طرف مائل کیا اور حضورؐ کی عطا کردہ روشنی میں اپنے آپ کو دیکھا تو انہی نوائے صبح گاہی سے دنیا میں عشق مستی کا ایک جہاں پیدا کر دیا۔

معرفت نفس کی طرف مائل ہونا ہی درس خُودی کا آغاز ہے اور یہ اشعار اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ اقبالؒ کی ساری شاعری میں ان کا "نظریہ خودی" رُوح کی حیثیت رکھتا ہے ۔

اقبالؒ صرف شاعر ہی نہیں

آسمانِ علم و ادب کے جتنے بھی چمکتے ہوئے ستارے ہیں اُن میں علامہ اقبالؒ ایک ایسا ستارہ ہے جس نے از سرِ نو اپنے سے پہلے ستاروں کو درخشندگی اور تابندگی بخشی ہے ۔ سماءِ ادب پر اپنا ایک الگ محور قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے ان ستاروں کے محور کو کسی حالت میں بھی یکسر نہیں چھوڑا ہے ۔ علامہ اقبال کو صرف شاعر قرار دینا ان کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہے ۔ ادب کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جو علامہ کی تابناک کرنوں سے روشن نہ ہوا ہو ۔

مذہبیات ہو یا اسلامیات، حکمت ہو یا فلسفہ، تنقید ہو یا تقریظ اور نظم ہو یا نثر۔ غرض وہ ہر فن کے مردِ میدان تھے۔ اُن کو صرف فلسفی کہنا اُن کی عظمت کے ساتھ تمسخر کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان کے یہاں فکر اور فلسفہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ پر مجموعی طور پر انھوں نے فکر انگیز خیالات پر زور دیا ہے۔ چنانچہ انکی دیگر تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں فن شاعری سے دلچسپی کم ہے۔ ان کی تمام تر توجہ فکر پر ہے، فن پر نہیں۔ پھر بھی ان کا فن عظمت و عروج کی ان بلندیوں تک پہنچا ہے جہاں دوسرے شعراء کی رسائی ممکن نہیں۔

اپنے تجربات، مطالعہ کائنات اور مطالعہ نفس کو انھوں نے اپنے اشعار میں بیان فرمایا ہے۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے انھوں نے نثر و نظم دونوں کا سہارا لیا ہے۔ ان کا "نظریہ خودی" اگرچہ نظم میں ہی ہے لیکن ان کی نثر بھی اس سے مبرا نہیں۔ انکی نثر و نظم دونوں ہی انکے نظریہ "خودی" کے ترجمان ہیں۔ انکی ساری کوشش اس بات پر مرکوز ہوتی ہے کہ انسان اپنی ہستی کا احساس کرے اور اپنے نفس کی حقیقت سے آگاہ ہے۔ کیونکہ انسان کی ہستی میں ہی حقائق و معارف اور عروج و زوال کے بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔

اِقبالؒ کی شاعرانہ زندگی کے ادوار

اقبالؒ کا شمار دنیا کے چند بلند پایہ اور ممتاز شعراء میں ہوتا ہے۔ اُنکی شاعرانہ زندگی کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ہر دور کا رنگ الگ الگ ہے۔ انکے کلام میں دہلی اور لکھنو کے شعراء کی طرح اگر ایک طرف ہجر و وصال اور گل و بلبل کی داستانیں اور افسانے ہیں، تو دوسری طرف ان کے اشعار میں وہ جوہر ہے جس کی ضرورت قومی بیداری کے لئے ناگزیر ہے۔ قومی ہمدردی، اسلامی وحدت و اُخوت، ہمت اور جوش، تعلیم و اخلاق، اُمید وار تقاءِ فلسفہ و تصوّف، غرض انکے اشعار سب کچھ ہیں۔ تعمیر و اخلاق کی باتوں سے ان کی شاعری معمور ہے۔ اقبال صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ فلسفی، مجتہد، مفکّر مصلح قوم و ملک اور حکیم اُمّت تھے۔

اقبالؒ کی شاعری کو چار بڑے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک تو ابتدائی دور، جس کو دورِ اوّل کہا جاتا ہے۔ ہر دور کی شاعری کی اپنی ایک الگ خصوصیّت ہے۔ پہلے اور دوسرے دور کا کلام

"بانگ درا" میں موجود ہے۔ تیسرے دور کا اردو اور فارسی کلام "اسرارِ خودی"، "رموز بیخودی" اور "پیام مشرق" میں موجود ہے۔ اسی طرح چوتھے یعنی آخری دور کا کلام "بالِ جبریل"، "ضرب کلیم"، "زبور عجم"، "جاوید نامہ" اور "ارمغان حجاز" پر مشتمل ہے۔ یہ آخری دور آپ کا زیادہ تر فارسی شاعری کا دور ہے۔

اوّل اوّل لوگ ان کے کلام کی طرف اُس وقت متوجّہ ہوئے جب اُنھوں نے پہلی دفعہ گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک مشاعرہ میں شرکت کی۔ صنفِ شاعری میں ان کی ابتدائی تخلیقات غزلیں تھیں۔ پہلی بار اُنھوں نے گورنمنٹ کالج کے ایک مشاعرہ میں ایک غزل پڑھی تو ان کی اس غزل کے درج ذیل شعر پر ان کو بے حد داد ملی۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

اس شعر کو سن کر مرزا ارشد گورگانی جیسے فاضل روزگار نے اُن کی بے انتہا تعریف کی۔ یہ ۱۸۶۹ء کا زمانہ تھا۔ جب اقبالؒ نے انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں اپنی مشہور نظم "نالۂ یتیم" پڑھی۔ یہ زمانہ ان کی شاعری کا ابتدائی دور تھا۔ اقبالؒ نے اپنی شاعری کے دوسرے دور میں بہت سی نظمیں انگریز شعراء کی نظموں سے متاثر ہو کر کہی ہیں۔ جو انتہائی دلچسپ نیز فلسفہ و حکمت اور اخلاق سے لبریز ہیں۔ اس زمانہ میں اقبالؒ کا زیادہ تر قیام یورپ میں رہا جہاں وہ غور و فکر اور زندگی کے گہرے حقائق کو سمجھنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس دور کی شاعری میں مناظر قدرت کی کامیاب تصویر

کشی ملتی ہے

اقبالؒ کی شاعری کا تیسرا دور ایک اہم دور سمجھا جاتا ہے۔ یہ سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۲۴ء تک کا زمانہ ہے۔ یہ دور ان کے شاعرانہ پیغام، ان کی تعلیم و فلسفہ نیز ان کے کمالاتِ شاعری کا نچوڑ ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء اور سنہ ۱۹۱۱ء میں مصائب و آلام کی مسلمانانِ عالم پر زبردست یورش ہوئی۔ ترکی خلافت کی بربادی اور بلقان و طرابلس کی خونریز لڑائیوں نے اسلامی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ چونکہ اقبالؒ ایک اچھے مسلمان اور عاشقِ رسولؐ تھے اور پھر بلند پایہ شاعر بھی تھے لہٰذا وہ اِن دردناک حالات سے متأثر ہونے کے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے دل پر ان حالات کا جو اثر پڑا اس نے ان کی اسلامی شاعری کی بنیاد رکھ دی اور پھر اس کے بعد ان کی زبان پر درد و اثر میں ڈوبے ہوئے ایسے اشعار آئے جنھوں نے ملّت کے خون میں جوش و حرارت کو تیز تر کر دیا۔ اکتوبر سنہ ۱۹۱۱ء میں جب آپ نے شاہی مسجد لاہور میں "حضورِ رسالتمآبؐ" کے عنوان سے ایک پُرسوز نظم پڑھی تو وہاں جتنے بھی سامعین تھے، ہر ایک کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں اور دل تڑپنے لگے۔ دربارِ رسالت میں عرض کرتے ہیں:

حضورؐ دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گُل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو ایک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنّت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تیری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا لہو ہے اس میں

اقبالؒ کے اس دور کی بعض ایسی نظمیں ہیں جو معرکۃ الآراء ہیں اور شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ شکوہ ۔ جواب شکوہ ، خضر راہ ، شمع و شاعر اور طلوع اسلام اسی دور کی تخلیقات ہیں ۔

اقبالؒ کی شاعری کا چوتھا اور آخری دور زیادہ تر فارسی اشعار پر مشتمل ہے ۔ اس دور میں انھوں نے اگرچہ اردو شاعری کی طرف بہت کم توجہ دی ، پھر بھی ۱۹۳۵ء میں جب انکی مقبول عام کتاب "بال جبریل" منظر عام پر آئی تو اس نے اردو شاعری کی دنیا میں ہلچل بپا کردی ۔ پھر انکی وفات کے بعد "ارمغانِ حجاز" شائع ہوئی ۔ جس نے اردو شاعری کو ارتقاء کی انتہائی بلندیوں پر پہنچادیا ۔ اس لئے کچھ عرصہ قبل "ضرب کلیم" شائع ہوچکی تھی جس کے متعلق محققین کی رائے ہے کہ ایسا دقیق اور بلند کلام اردو میں کیا دوسری زبانوں میں نظر نہیں آتا ۔ بہرحال یہ مختصر سا تذکرہ ان کی شاعری کے اردو کی خصوصیات کو نمایاں کرنے کے لئے تھا ۔ اب ہم اصل مقصد یعنی انکے نظریہ خودی کی طرف دوبارہ متوجہ ہوتے ہیں جو ان کی شاعری کا اصل الاصول ہے ۔

خودی شیر مولا ، جہاں اس کا صید
زمین اس کی صید ، آسمان اس کا صید

تحقیق لفظ خودی

خودی عربی زبان کا نہیں، فارسی زبان کا لفظ ہے اور یہ خود سے بنا ہے۔ خود کا مطلب اپنا آپ ہے یا "میں" ہے۔ علامہ کے فکر کا مرکزی نقطہ خودی ہے۔ خودی سے ان کی مراد نفس یا تعیّن ذات ہے[1] فلسفہ اور مذہب میں "خودی" کے کئی مترادفات پائے جاتے ہیں جیسے روح soul نفس Nouns انا self اور ایگو Ego وغیرہ۔ خودی سے مراد ہر وہ شیئی ہے جس پر "میں" کا اطلاق ہو۔ اس لحاظ سے اس کے وسیع ترین مفہوم میں انسان کی "خودی" ان تمام چیزوں کا مجموعہ ہے جنھیں وہ "اپنا" کہہ سکتا ہے خالص فلسفیانہ مفہوم میں خودی یا "انا" کا تصور بہر کیف انفرادی شعور ہی تک محدود کیا جاتا ہے۔ رُوح یا خودی کی ماہیت کو جاننے کے لئے انسان ہمیشہ کوشاں رہا ہے۔ فکر انسانی کے ہر دور میں اس پر غور و فکر ہوتا رہا ہے۔ اس غور و فکر میں مغربی اور مشرقی دانشوروں کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ مشرق میں اس مسئلہ کو دینی اعتقادات کی روشنی میں اور مغرب میں اسے آزادانہ طور سمجھا گیا ہے۔ مغربی فلسفہ کا اوّلین سرچشمہ یونان ہے۔ بہر کیف خودی کی اصل حقیقت جاننے کے لئے ہمیں قرآنِ حکیم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ کیونکہ کتاب الٰہی ہونے کے ناطے اس بارے میں اس کا فیصلہ قول فیصل کی حیثیت رکھے گا۔

---

[1] مقدمہ "اسرار خودی" طبع اوّل۔

خودی کی تشریح مختلف لوگوں نے مختلف طریقوں سے اپنے مقدورِ علم کے مطابق کی ہے۔ جو شخص ذات "میں" یعنی "انا" کو زیادہ اہمیت دے وہ لوگوں میں متکبّر یا مغرور یا انانیت کا پتلا قرار دیا جاتا ہے اس پس منظر میں خودی سے انانیت غرور تکبّر کے معانی اخذ کئے جاتے ہیں[1]

اسی لئے وجود یا خود کو بہت خطرناک سمجھا گیا ہے۔ اور اس سے کنارہ کشی کی تعلیم دی گئی ہے۔ مثلاً ابوسعید ابوالخیری کہتے ہیں۔

با مارِ سیاہ نشین و با خود منیشین

یعنی سیاہ سانپ کے نزدیک بیٹھ لیکن اپنے وجود کا ہم نشین نہ ہو۔ بالفاظ دیگر خود کو مارِ سیاہ سے بھی زیادہ خطرناک بتلایا گیا ہے اور اس کی صحبت سے بچنے پر اُبھارا گیا ہے۔ عرب کا ایک فلسفی شاعر ابوالعلاء المعرّی وجود انی کو سب سے بڑا گناہ اس لئے سمجھتا ہے کہ اس نے اس کو خُدا سے الگ کر رکھا ہے۔

"تمھارا وجود وہ گناہ ہے جو تصوّر میں بھی نہیں لایا جا سکتا ہے"

چنانچہ اس کے نزدیک اس وجود کو ختم کرنا ہی بہتر ہے اور اس کو جس قدر تکلیف پہنچائی جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ اس نظریہ کے ماننے والے دراصل خود کو وجود یا جسم کے معنی میں لیتے ہیں اور وجود یا جسم کا تعلق دنیا سے ہے لہٰذا ان کی نگاہ میں دنیا کو ترک کر دینا چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے وجود کو ترک کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ہندومت اور بدھ مت بھی ایسے ہی خیالات کا مجموعہ ہیں۔ (اطرافِ اقبالؒ)

---

[1] نسیم اللغات۔

خودی اور خدائی کا تعلق

اقبالؒ مذکورہ نظریہ کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں اور اس دنیا کو چھوڑ کر ہی غاروں اور پہاڑوں میں بس جانے نیز وہاں ریاضت و مجاہدہ سے خدا کو پانے کی کوشش کو وہ کافری قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنی خودی کو مٹانے کا نظریہ کفر پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ اسلام خودی کے چراغ کو روشن کرنا چاہتا ہے اور وجود کے مٹانے کے خلاف ہے۔ گویا اقبالؒ نے نفی وجود کے بجائے اثباتِ وجود کا نظریہ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے صوفیاء کے نظریات کا جائزہ لینے کے بعد اپنا فلسفہ خودی اس طور پر پیش کیا ہے جو قرآنی مقاصد کو عملی شکل عطا کرتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے خودی کے مروجہ مفہوم کو بدل ڈالا۔ اور اس سے "وجود" مراد لینے کے بجائے "روح" مراد لی۔ اور صوفیاء کے اس نظریہ کو قبول کرلیا جس کے تحت خودی خدا کا ہی ایک جزء ہے۔ تاہم اس سے علیحدہ ہو کر اس نے ایک مستقل وجود کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ قرآن اس خیال کی تائید "وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي" (اور میں نے اس میں اپنی روح پھونک دی[1]) فرما کر کرتا ہے۔

---

[1] القرآن: سورۃ الحجر، آیت ۲۹۔

اقبالؒ اپنے خطبات میں خُدا کو لامحدود خودی یا خودی کامل قرار دیتا ہے۔ جو انسانی خودی کی پیدائش کا باعث ہے ۔ خودی اور خُدا کے تعلق کو سمجھانے کے لئے علامہ اقبالؒ کئی مثالیں پیش کرتے ہیں ۔ اُنھوں نے خُدا کو قرآن اور خودی کو سی پارہ، خُدا کو سورج اور انسان کو ستارہ بتلایا ہے۔ قرآن کے بغیر سی پارے کا وجود ناممکن ہے اور سورج کے بغیر ستارے کی ہستی بے معنی ہو کر رہ جائے گی ۔ خودی اور خُدا کے تعلق کو بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ سمندر اور اس کی موجیں دو مختلف چیزیں ہونے کے باوجود ایک ہی ہیں ۔ موج اپنی پیدائش سے پہلے بھی سمندر میں موجود ہوتی ہے ۔ موج کا یہ خاص نام اس کو اس وقت ملتا ہے جب وہ ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے ۔ فرماتے ہیں کہ اس طرح خودی بھی خُدا کی ذات میں موجود تھی[1]۔

۔خودی خُدا سے علیٰحدہ ہو کر جب اپنا الگ وجود قائم کر لیتی ہے تو اس کا رشتہ خُدا سے قطعی طور منقطع نہیں ہوتا ہے ۔ علیٰحدگی کے باوجود خُدا سے اس کا رشتہ ہر وقت برقرار رہتا ہے ۔ خُدا کی ذات سے اس کو تقویت ملتی ہے ۔ جب انسان کی خودی صحیح اور مکمل انداز میں تقویت حاصل کر لیتی ہے تو اسے کمالِ عرفان حاصل ہو جاتا ہے ۔ ایسی خودی کے مالک کو عوام میں عارف کہا جاتا ہے ۔ ابُو عثمان مغربی فرماتے ہیں کہ عارف کے سامنے علم کے وہ انوار چمکتے ہیں کہ ان کے سبب وہ غیب کے عجائبات کا مشاہدہ بآسانی کر سکتا ہے ۔ اسی طرح شیخ کبیر عارف باللہ ابو سعید خزارؒ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے

---

[1] حیات اقبال

بندوں میں سے کسی بندہ کا کفیل اور متولی بننا چاہتا ہے تو اس پر اپنے ذکر کا دروازہ کھول دیتا ہے اور جب وہ ذکر سے لذّت پانے لگتا ہے تو پھر اس پر قُرب کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ یہاں تک کہ پھر اُس سے مجلس اُنس کی طرف اُٹھا کر توحید کی کرسی پر بٹھا دیتا ہے اور اپنے اور اس کے درمیان سے حجاب اُٹھا دیتا ہے۔ نیز اسے دار وحدانیت میں جاگزین فرما کر جلال وعظمت کے حجاب کو اس کے سامنے سے دُور کر دیتا ہے۔ ایسے عالم میں وہ متحیر و متعجب ہو کر نیز حق سبحانہٗ کی حفاظت میں آکر خواہشات نفس سے بالکل پاک وصاف ہو جاتا ہے اور قابل رشک سلطنت و حکومت کا مالک بن جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے فرمایا کہ دنیا والوں نے دنیا میں راحت تلاش کی لیکن انھیں راحت نہ ملی۔ اگر انھیں اس سلطنت وحکومت کی خبر ہو جاتی جو ہمارے قبضہ میں ہے تو اس پر تلواروں سے لڑ مرتے۔ ایسے انسان کو ہم رُوحانی طاقت یا طاقتِ خودی کا مالک کہتے ہیں۔ پھر اس انسان کا چلنا اللہ کا چلنا، اس کا کہنا اللہ کا کہنا، اس کا سننا اللہ کا سننا اور اس کا دیکھنا اللہ کا دیکھنا ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کے ہر قول وفعل کو ہمہ وقت تائید ایزدی حاصل ہوتی ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ ایسوں سے عداوت رکھنا خُدا سے لڑائی مول لینے کے مترادف ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے جو میرے ولی سے عداوت باندھے تو میں اسے اپنی جانب سے لڑائی کی اطلاع دیتا ہوں اور جن اعمال کے ذریعے میرا بندہ مجھ سے قُرب طلب کرتا ہے ان میں سب سے محبوب میرے نزدیک وہ عبادتیں ہیں جو میں نے

اس پر فرض کی ہیں اور جب میرا بندہ نوافل[1] کے ذریعے میرا قرب طلب کرتا ہے تو میں اسے چاہنے لگتا ہوں اور جب میری محبت بڑھتی ہے تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں کہ وہ اسے سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں کہ اسے دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں کہ اسے پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں کہ اسے چلتا ہے اور اگر کچھ مجھ سے مانگتا ہے تو میں دیتا ہوں۔ اور اگر وہ پناہ چاہتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔ اس حدیث کی روشنی میں قریب و دور سے دیکھنے اور سننے کا کوئی مسئلہ باقی نہیں رہ جاتا کیونکہ بصارتِ الٰہی اور سماعتِ الٰہی ہر جگہ یکساں طور پر حاوی ہیں۔ یہاں کسی قسم کا فرق کرنا کافری کے برابر ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کے کسی خاص بندے کی قوتِ بصارت و سماعت طاقتِ ربّانی کی مظہر ہو تو اس کے ساتھ قُرب و بعد کی قید لگانا انتہائی نادانی اور کم علمی کی بات ہے۔ علامہ اقبالؒ اس حقیقت کو یوں پیش فرماتے ہیں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز (بالِ جبریل)

ان صفات کا حامل شخص اقبالؒ کی نگاہ میں مردِ مؤمن ہے۔ ان کا یہ مردِ مؤمن فوق البشر کے خلاف خیر البشر ہے۔ کیونکہ یہ خودی یا رُوحانیت کی دولت سے سرفراز ہوتا ہے۔ خُدا اور انسان دونوں رُوح یا خودی ہی ہیں۔ خُدا لامحدود خودی اور انسان محدود خودی کا نام ہے۔ لیکن دونوں

---

[1] نوافل سے مراد نافلہ عبادات ہیں خواہ وہ مالی عبادت ہو یا بدنی عبادت۔

کا رشتہ غیر منقطع ہے ۔ پھر خودی کی جلوتوں اور خلوتوں کی پردہ کشائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

خودشناسی خداشناسی

انسان کی خودی جس قدر مکمل ہوتی جاتی ہے، اسی قدر اس کو قرب خداوندی نصیب ہوتا جاتا ہے ۔ بنابریں دنیا کی سب سے اعلیٰ شیئ انسان کی خودی ہی ہے ۔ اس لئے اقبال فرماتے ہیں کہ اگر خدا کو تلاش کرنا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو تلاش کرو ۔ بالفاظ دیگر اپنے آپ کو پہچان لینا اللہ کو پہچاننے کے مترادف ہے ۔ امام غزالیؒ اس بات کو سمجھانے کے لئے اپنے فلسفے کی بنیاد اس قول پر رکھتے ہیں ۔ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" (جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے بہ تحقیق اپنے رب کو پہچانا) گویا انسان جب اپنی خودی کو پالے گا تو وہ خدا سے خود بخود مل جائے گا ۔

اگر خواہی خدا را فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیاموز

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ دل اور عقل حیران ہیں کہ تیری تلاش میں

نکلوں یا اپنے آپ کو تلاش کرنے جاؤں ۔

من بہ تلاش تو روم یا بہ تلاش خود روم
عقل و دل و نظر ہمہ گم شدگان کوئے تو

علامہ فرماتے ہیں کہ خودی کا وجود بہرحال خُدا سے الگ ہے اور وہ وجود کبھی بھی فنا نہیں ہوسکتا ہے ۔ اس طرح صوفیاء کے اُس خیال کی تردید کرتے جس کے مطابق انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ خُدا کی ذات میں خود کو ضم کردے ۔ علامہ اپنے نظریہ کو مدلل فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کی معراج انسانی عروج کی انتہا ہے ۔ تاہم جب وہ خُدا کے عین حضور میں حاضر ہوئے تو ان کا علیحدہ وجود برقرار رہا ۔ علامہ واقعہ معراج سے یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خودی کی انتہائی بلندیوں پر بھی انسانی وجود خُدا کی ذات میں جذب نہیں ہوتا بلکہ اپنا الگ وجود قائم رکھتا ہے ۔

خودی میں گم ہے خُدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاح کار کی راہ

اقبالؒ کائنات کی ہر شئی کو خود نمائی کا پیکر قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خودی کی تعمیر میں خُدائی کا راز پوشیدہ ہے ۔

ہر چیز ہے محو خود نمائی — ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمود، زندگی موت — تعمیر خودی میں ہے خُدائی

رُوح زندہ ہے

رُوح فنا نہیں ہوتی اور اس طرح انسان کا وجود برقرار رہتا ہے۔ ہر چند کہ مرنے کے بعد انسانی وجود کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی رُوح کسی دوسری شکل میں برقرار رہتی ہے اور رُوح کی یہی دوسری شکل اللہ کے سامنے جواب دہ ہوگی۔ بالفاظ دیگر جسم کی وجہ سے ہم نہیں ہیں بلکہ ہماری وجہ سے جسم ہے۔ اس لئے جب یہ جسم نیست ہو جاتا ہے، تب بھی ہم ختم نہیں ہوتے۔ موت کا فرشتہ ہمارے بدن کو چھوتا ہے مگر اس وجود کے مرکز رُوح سے دُور رہتا ہے۔ اقبالؒ اسی حقیقت کو "ضرب کلیم" میں اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

مہ و ستارہ مثال شرارہ یک دو نفس
مے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
تیرے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے

بال جبریل میں اسی نکتہ کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں۔

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جان مرتی نہیں مرگ بدن سے

غرض رُوح بدن کے اندر مقیّد ہوتی ہے ۔ مرکر وہ اس قید سے نجات حاصل کرتی ہے اور اپنے کمال طاقت کی مالک ہو جاتی ہے ۔

اقبالؒ ہر پہلو سے فنا کے مسئلے کے خلاف ہیں اور فرماتے ہیں کہ انسان مرکر بھی زندہ رہتا ہے ۔ انکے نزدیک دراصل زندگی اور خودی ایک ہی چیز ہے ۔ اگر زندگی تلوار ہے تو خودی اس کی دھار ہے ۔ زندگی بغیر خودی اور خودی بغیر زندگی کوئی طاقت نہیں رکھتی ۔

یہ موج نفس کیا ہے ؟ تلوار ہے | خودی کیا ہے، تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے ؟ رازِ درونِ حیات | خودی کیا ہے ؟ بیداریٔ کائنات

خودی سے آشنا لوگوں کو علّامہ اقبالؒ اعلیٰ مقام پر فائز قرار دیتے ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ خودی زندگی کی عزّت و آبرو اور بادشاہی ہے ۔ اگر خودی نہ ہو تو روسیاہی ہے ۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام بادشاہی
تیری زندگی اسی سے تیری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

خودی کا تعلق عشق اور زندگی سے

خودی زندگی کی نکھری ہوئی صورت یا اس کا جوہر ہے۔ عشق، زندگی اور خودی، اقبالؒ کے ہاں ان تینوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اس لئے انھوں نے خودی کو زندگی کی تلوار کی دھار کہا ہے اور عشق کو زندگی کا نور اور نار قرار دیا ہے۔ وہ زندگی کا جوہر عشق اور عشق کا جوہر خودی بتلاتے ہیں۔

جوہر زندگی ہے عشق، جوہر عشق ہے خودی

گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خودی کے لئے عمل، عشق، آرزو اور مقاصد ضروری ہیں۔ ان چاروں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ آرزو عشق کی خالق ہے اور عشق عمل کا پیدا کرنے والا ہے۔ خودی کی تربیت کے لئے تین بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ۱۔ توحید ۲۔ آئین ۳۔ رسالت۔ یعنی ایک خدا، ایک کتاب اور ایک رسول۔ یہ تینوں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خودی قرآن، رسولؐ اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہو۔ جب خودی ان تینوں سے ذرہ برابر بھی انحراف کرتی ہے تو وہ اسفل سافلین کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسی حالت میں خودی، خودی نہیں رہتی ہے۔ اگر ہم ان تینوں چیزوں کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیں تو ہم بے دریغ کہہ اُٹھیں گے کہ انسان کو انسانِ کامل بننے کے لئے ان تینوں کے ساتھ

اپنا مکمل رشتہ جوڑنا ناگزیر ہے اور انسانی حیات کا مقصد صرف انھیں کو جاننا ہے کیونکہ کائنات کی بنیادی یہی تین چیزیں ہیں۔ اقبالؒ نے اپنے فلسفۂ خودی اور بے خودی کی عمارت قرآنی اصولوں پر تعمیر کی ہے اور اس نے اسلام کے بے بہا خزانہ سے موتی چُن چُن کر سجایا ہے۔ کیونکہ تمام انسانیت کی بھلائی اسی میں ہے اور کوئی نظام حیات ساری انسانیت کو ایک مرکز پر لانے کے قابل نہیں ہے اور نہ دُنیا کے کسی آئین میں پائداری ہے کیونکہ انسان دراصل اللہ تعالیٰ کی ہی مرضی کے مطابق تخلیق کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کی خاطر اللہ تعالیٰ ہی کا آئین ضامن اور کافی ہوسکتا ہے۔

علّامہ نے خودی کی تعمیر اور استحکام کا سب سے بڑا ذریعہ عشق قرار دیا ہے۔ بعض اوقات تو وہ عشق کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ خودی عشق کا دوسرا نام یا اس کے مترادف نظر آنے لگتی ہے۔ دراصل خودی عشق کا جوہر ہے۔ حضورؐ سے عشق کرتے ہوئے اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اللہ عاشقانِ نبیؐ سے بزبان قدرت یوں پکارتا ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی پسپائی اور ذلت کا باعث یہ ہے کہ انھوں نے رسول اکرمؐ سے عشق کرنا ترک کر دیا ہے۔ اس حقیقت کو انھوں نے اپنے اشعار میں یوں واشگاف کیا ہے۔

ؔ شبے پیشِ خدا بگریستم | مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم | دلے دارند و محبوبے ندارند

منصور اور تصوّر عشق و خودی

منصور یعنی حلاّجؒ نے اپنے دور میں انانیت کو بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔ وہ اس طور پر کہ ان کا سارا وجود کلمہ "اَنَا الحق" میں ضم ہو گیا تھا۔ اقبالؒ نے منصور کے اس مخصوص طرز خیال کی ایک بالکل اچھوتی تفسیر کی اور "اَنَا الحق" کو مقام کبریا قرار دیا۔ منصور فرماتے ہیں: "لَا فَرْقَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ رَبِّیْ اِلَّا بِصِفَتَیْنِ وُجُوْدُنَا مِنْهُ وَقِوَامُنَا بِہٖ" میرے اور میرے ربّ کے درمیان سوائے دو صفتوں کے کوئی فرق نہیں۔ ایک صفت تو یہ کہ ہمارا وجود اسی سے ہے اور دوسری یہ کہ ہماری پائداری اسی پر منحصر ہے۔ نتیجۃً منصور کے اس نظریۂ پر لوگ دو گروہوں میں منقسم

لہ

منصور کا اصل نام حسین ہے۔ انکی کنیّت ابوالمغیث اور ابو عمارہ ہے اور انکے والد ماجد کا نام منصور تھا۔ خود بھی اسی نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے نداف تھے جس کے لئے عربی میں الحلاّج کا لفظ آتا ہے۔ سنہ ولادت غالباً ۲۶۰ھ ہے اور یومِ وصال ۲۴ ذی قعدہ ۳۰۹ھ (مارچ ۹۲۲ء) انکی جائے ولادت بغداد ہے۔ جہاں سے انکی لاش کو دریائے دجلہ میں بہا دیا گیا تھا۔

(محفل اقبال: کلچرل اکادمی: پروفیسر محی الدین حاجتی)

ہو گئے ۔ ایک گروہ اس کا پرستار اور دوسرا اس کا مخالف بن گیا ۔ مخالف گروہ کے علماء نے اس کو تختہ دار پر چڑھا کر اس کی لاش کو دریا برد کر دیا۔ منصور نے "دائرۃ النقطہ" میں لکھا ہے کہ "عالم انتظار میں گرفتار انسان نے مجھے زندیق اور عالم وجدان کے عارف نے مجھے عالم ربانی گمان کیا۔ اقبالؒ نے فرمایا کہ :

اگر ہو عشق تو کُفر بھی ہے مُسلمانی

نہ ہو تو مردِ مسلمان بھی کافر و زندیق

اس پس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ اقبالؒ اور منصور کے اندازِ فکر میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔ دونوں بزرگ رند بھی اور فلسفی بھی کہلائے جاتے ہیں ۔ لیکن دونوں کے عشق میں فرق ہے ۔ منصور حال، ماضی اور مستقبل تینوں کا انکار کرتے ہوئے فرماتے ہیں، " اَیُّھَا الظَّانُّ لَا تَحْسَبْ اِنِّی اَنَا الآنَ اَوْ یَکُوْنُ اَوْ کَانَ "[1]

منصور عالم ارضی کو الوداع کہہ کر عالم عشق میں جا بسے لیکن علامہ کا طرز عمل اس کے برعکس تھا۔ خالق کائنات کے تکوینی منصوبے میں محمد مصطفیٰؐ ہی واحد واجب الاطاعت ہیں ۔ منصور اور اقبالؒ دونوں یکساں طور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد لوگوں کو وہ اس کی تعلیم دیتے ہیں ۔ ہر چند کہ دونوں کے درمیان ایک ہزار سال سے زائد مدت کا وقفہ ہے ۔

---

[1] اے گمان کرنے والے ! یہ خیال مت کر کہ اس وقت "میں" یا "میں ہوں گا" یا یہ کہ "میں تھا ۔ (محفل اقبال : طاسین العلم)

منصور نے فرمایا ہے:

"هُوَ الاوّل فی الوصلۃِ، هُوَ الآخِرُ فی النبوۃِ
هُوَ الباطنُ بِالحقیقۃِ هُوَ الظاهِرُ بِالمعرفۃِ"

(محفلِ اقبالؒ)

اقبالؒ اس حقیقت کو اور زیادہ واضح طور پر یوں پیش کرتے ہیں:

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اقبالؒ اپنے علم و دانش اور عشق و مستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جلوۂ او قدسیاں را سینہ سوز
بود اندر آب و گل آدم ہنوز

کمالِ عروج، عرفانِ ذات اور حصولِ مرتبتِ رُوحانی کے لئے دونوں عشق نبیؐ اور ایمان بالنبوۃ کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ دونوں کو اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے رُوحِ انسانی یا انسان کی خودی کسی نہ کسی مقام پر لغزش کا شکار ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ہر قسم کی لغزشوں سے بچنے کے لئے اور عرفانِ ذات حاصل کرنے کے لئے نبوت پر ایمان لانا لازمی ہے۔ منصور نے آنحضورؐ کو کائنات میں بطور "سرّ الاسرار" اور اقبالؒ نے بحیثیت مولائے کُل تصوّر کیا ہے۔

وہ دانائے سُبل، ختم الرّسل، مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا ہے فروغِ وادیٔ سینا

اِقبال اور تصوّف

تصوّف اگرچہ سراسر خودی نہیں ہے لیکن خودی کی ابتدائی کڑی ضرور ہے۔ میدانِ تصوّف صدیوں سے چار بڑے درجوں میں منقسم رہا ہے۔ فنا فی الشیخ، فنا فی الرّسول، فنا فی اللہ اور بقا باللہ۔ عالم باطنیت فنا فی الرّسولؐ کے اندر ہی محدود ہے۔ بلکہ اس سے آگے کسی سالک کا شعور چل ہی نہ سکتا ہے۔ یہ نظریۂ منصور اور اقبال دونوں کا ہے۔ چنانچہ اقبال نے نفی وجود کے بجائے اثباتِ وجود کا نظریہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے صوفیاء کے نظریات کا جائزہ قرآن کی روشنی میں لیا اور پھر اس کے بعد اپنا فلسفۂ خودی پیش کیا۔ خودی کی خلوتوں کی لطافت میں گم رہ کر اپنے آپ کو مقامِ لامکان میں پایا۔ علامہ کی رباعیات اس امر کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتی ہیں۔

خودی کی خلوتوں میں گم رہا میں | خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا | مقام رنگ و بو کا راز پا جا
برنگ بحر ساحل آشنا رہ | کف ساحل سے دامن کھینچتا جا

اسی طرح ایک دوسری رباعی میں فرماتے ہیں:

حکیمی نامسلمانی خودی کی | کلیمی رمز پنہانی خودی کی
تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں | غریبی میں نگہبانی خودی کی

علامہ اقبالؒ کی زندگی پر وحدت الوجود کا نہیں وحدت الشہود کا رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ صوفیت کے قائل تھے لیکن وہ موجودہ صوفیت سے ہمیشہ نالاں رہے۔ کیونکہ موجودہ صوفیت انکے خیال میں مسلمانوں کو رہبانیت کی تعلیم دے کر خانقاہوں میں جا بیٹھنے کی تلقین کرتی ہے نیز انھیں بزدل اور تن آسان بنا دیتی ہے۔ دنیا پرست ملاؤں سے بیزاری کے ساتھ ساتھ وہ خود غرض اور نام نہاد صوفیوں سے بھی نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور ان دونوں کو اسلام اور مسلمانوں کا دشمن قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ حضرات قرآن کو غلط رنگ میں پیش کر کے انسان کو غلط تاویلات کے تلاطم میں پھنسا دیتے ہیں۔ اور پھر اس کو گوسفندی کا درس دیتے ہیں۔ اپنے کو قرآن کے سانچے میں ڈھالنے کے بجائے قرآن کو اپنے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ وہ ایسے ملاؤں اور صوفیوں سے نالاں ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے ہاتھ سے تلوار چھین کر انھیں خانقاہوں میں بٹھا دیا۔ اور اسلام کے شیرازہ کو بکھیر کر مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد کو تہس نہس کر ڈالا اور ملت اسلام کو کئی فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ ایسے ملاؤں اور صوفیوں سے علامہ بیزار نظر آتے ہیں تاہم وہ ان مولویوں سے ہرگز نالاں نہیں ہیں جن کو صحیح علمی بصارت حاصل ہے اور واقعۃً جو عالم فاضل ہیں ایسے مولویوں کے علامۂ اقبالؒ ثنا خواں ہیں۔ اس حقیقت کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سید سلیمان ندوی سے برابر خط و کتابت کرتے رہے اور ان سے فقہی مسائل اور مذہبی الجھنوں کو سلجھانے کے سلسلے میں برابر مشورہ لیتے رہے۔ علامہ اقبالؒ نے مولانا سید سلیمان ندوی کی شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کو

اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد قرار دیا ہے۔ علامہ اقبالؒ جہاں ملاؤں، فقیہوں اور واعظوں کے خلاف لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں وہاں انکی مراد اُن لوگوں سے ہوتی ہے جو بے عمل، فتنہ پرور اور ناعاقبت اندیش ہیں اور جنھوں نے قرآن کو اپنے خواہشات کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اور قوم کے فکر و ذہن کی شہہ رگ کو بے ہوشی کا شکار بنا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کی قوتِ فکر مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ اقبالؒ نے ایسے لوگوں کی پول کھول دی ہے۔

فرماتے ہیں:

نہ فلسفی سے نہ ملّا سے غرض ہے مجھکو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

دوسری جگہ یوں رقمطراز ہیں:

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

علامہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ واعظ، مبلّغ اور قائد قوم بھی تھے۔ اُن مولویوں، واعظوں کے بارے میں جو منبروں کے غازی اور عشق کے صرف شارح ہیں، فرماتے ہیں کہ یہ خود غرض کیا جانیں کہ قوم کیا چیز ہے؟ اور قوم کی امامت کیا ہے؟ وہ اس راز سے واقف ہی نہیں ہے۔

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملّا نہ حکیم
وحدتِ افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

قوم کیا ہے قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

فرماتے ہیں کہ ملّا عشق کا دعویٰ تو کرتا ہے مگر راز عشق سے بے خبر

اور کوسوں دُور ہے۔ اس کو کیا معلوم کہ عشق کے کیا تقاضے ہیں ؟ عشق منبر پر کھڑے ہو کر گرجنے کا نام نہیں ہے۔ اسی طرح دھیمے دھیمے اور سُریلے تیز میٹھے لحن میں نعت خوانی کو عشق نہیں کہتے ہیں۔ بلکہ عشق اسلام کی خاطر اسلام کی سرحد پر تلوار لیکر پاسبانی کرنے کو کہتے ہیں۔ اور اسی طرح اسلام کی خاطر تختۂ دار پر چڑھ جانے کا نام عشق ہے۔ جب عشق قوّتِ ابراھیمی سے لبریز ہو تو وہ نار نمرود سے نہیں ڈرتا بلکہ خوشی خوشی اور شوق سے دہکتی ہوئی آگ میں کود کر ساری دنیا کو عالم حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ عشق قربانی کا نام ہے۔ اس کا مقام منبر نہیں، بلکہ تختۂ دار ہے۔

میاں اندر دو حرفے سرکار است
مقام عشق ممبر نیست دار است

براہیماں ز نمرود آں نترسند کہ موم خام را آتش عیار است

نام نہاد صوفی اور خود غرض ملّا دونوں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اس لئے اقبالؒ ایسے صوفیوں کے ساتھ ساتھ ایسے ملّاؤں کو بھی اپنی ملامت کا نشانہ بنا کر فرماتے ہیں

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکہ کا ملّا ہو غازی

ان کے خیال میں دونوں ایک ہی خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور دونوں اس بات پر قانع ہیں کہ مسلمانوں کو سجدے کی اجازت ملی ہوئی ہے۔ ایک نے اسلام کو مسجد کی چار دیواری میں مقیّد کر رکھا ہے اور

دوسرے نے اس کو ترک دنیا کی علامت بنا رکھا ہے۔ بنا بریں دونوں ہی ابلیسی چالوں کا شکار ہیں۔

ملّا کو جو ہند میں ہے سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

صُوفی سے وہ اس لئے نالاں ہیں کہ اس نے قوم کو بے عملی کا سبق پڑھا کر بُزدل بنایا ہے۔ اسے ترک دُنیا کی تعلیم دے کر رہبانیت کی طرف مائل کر دیا ہے۔ اور قوم کو صوفیت کے جامے میں بُدھ مت اور ہندو مت کا لباس پہنا دیا ہے۔ دنیوی زندگی کو خواب اور بے حقیقت بتلا کر قوم کو عمل سے کنارہ کش کر دیا ہے۔ ایک صوفی حُجرے یا پہاڑ کی کھوہ میں تسبیح لیکر نفس کشی کرنے کو اسلام سمجھتا ہے۔ حالانکہ قرآن سے اس طرزِ عمل کی تائید کسی صورت میں بھی نہیں ہوتی۔

اقبالؔ تصوّف کو عجمیوں کے ذہنوں کا پھل اور ان کے دماغ کی اختراع سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں تصوّف کا تعلق اسلام سے کسی زمانے میں بھی نہیں رہا ہے۔ اسی لئے وہ تصوّف کی مخالفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"اس میں ذرا شک نہیں کہ تصوّف کا وجود سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کے دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔"

(اقبال نامہ)

دُوسری جگہ اپنے ایک خط میں یُوں رقمطراز ہیں:

"لیکن ہندی اور ایرانی صوفیاء میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر ویدانت اور بُدھ مت کے زیر اثر کی ہے

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے میرے عقیدے کی رُو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ ایک معنی میں میری تمام تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔"

(اقبال نامہ)

اقبال چاہتے ہیں کہ مسلمان دنیا پرست ملّا اور خود غرض نام نہاد صوفی کے پھندے میں پھنسنے کے بجائے ان سے احتراز کریں اور صرف قرآن کو اپنا ضابطۂ حیات بنائیں۔ قرآن کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دوسروں کے لئے مشعل راہ ہوں۔ اقبال کے خیال میں قرآن ہی مسلمانوں کے لئے زمین پر انکی عزّت و آبرو کا ضامن ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا نزول صرف اس لئے نہیں ہوا ہے کہ مرتے وقت سرہانے پر سکراتُ الموت کی آسانی کی خاطر اس کی تلاوت کی جائے۔ قرآن حکیم زندگی کی ساری مشکلات کا حل پیش کرتا ہے اور انسانوں کے لئے ایک مکمّل نظام زندگی عطا کرتا ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ اقبال جس طرح سارے مولویوں کے خلاف نہیں ہے اسی طرح وہ تمام صوفیوں کے خلاف بھی قلم فرسائی نہیں کرتے ہیں۔ جن صوفیوں کی صوفیت ایمان و ایقان کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہے اُن سے وہ محبّت کرتے ہیں اور جو صوفی حضرات بے عملی کا درس دے کر قوم کو مفلوج کرنے کی کوشش کرتے ہیں ایسے صوفیوں سے وہ نالاں ہیں۔ اُنکے برعکس جن صوفیوں کی زندگی قرآن کے عین مطابق ہے اور وہ قرآن سے قوّت حاصل کرتے ہیں اور اسے رُوحانی زندگی کا منبع سمجھتے ہیں۔ اقبال ایسے صوفیوں کی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔

حضرتِ علی بن عثمان ہجویری المعروف داتا گنج بخش نے اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں صوفی کی تعریف کرتے ہوئے حضرتِ ابوبکر الصدیق رض، حضرتِ عمر رض، حضرتِ عثمان رض، اور حضرت علی رض کو صوفیوں کا امام قرار دیا ہے۔ نیز اہل بیت میں سے امامِ حسین رض کو صوفیہ کا امام کہا ہے۔ اقبال نے مذکورہ بالا حضرات کی بے پناہ تعریف کی ہے۔ چنانچہ وہ امام حسین رض کو بنائے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہکر خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

رمزِ قرآں از حسین آموختیم ٭ زآتشِ او شعلہ ہا اندوختیم

اسی طرح علامہ اقبال داتا گنج بخش کے بھی ثنا خواں ہیں۔ اُن کے متعلق کہتے ہیں:

سیّدِ ہجویر مخدومِ اُمم	مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم
بندہائے کوہسار آساں گسیخت	در زمینِ ہند تخمِ سجدہ ریخت
خاکِ پنجاب از دمِ او زندہ گشت	صبحِ ما از مہرِ او تابندہ گشت

اقبال کے کلام کا مطالعہ ہم پر یہ بات واضح کرتاہے کہ اقبال نے صوفیوں کے دو گروہوں کا تذکرہ جا بجا کیا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کا فقر مسلمانوں کو ملوکیت کا غلام بناتا ہے۔ اور دُوسرا وہ ہے جن کا فقر شبیر کا دل عطا کرتا ہے۔ ایک فقر مسکینی و ناامیدی اور دوسرے کا فقر قیصر و کسریٰ کی ہلاکت کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ ..... ثانی الذکر کی تعریف علامہ جا بجا فرماتے ہیں۔ جن شاعروں نے وحدۃ الوجود

کا نظریہ اور بے عملی و بے راہ روی کا تصوّر پیش کیا ہے، علامہؒ اُن کی ملامت کرتے ہیں اور ان کے نظریات کو غیر اسلامی بتاتے ہیں۔ ایسے شعراء کے خلاف لب کشائی کرتے ہوئے اسرار خودی میں وہ فرماتے ہیں۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار
آں فقیہہ اُمّت مے خوارگاں
آں امام امّت بیچارگاں

علامہ نے حافظ کو اس منفی رجحان کا سب سے بڑا نمائندہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا زیادہ تر اپنی ملامت کا نشانہ اُنھیں کو بنایا ہے۔ ہر چند کہ حافظ کے ہمنوا اور دفاع کرنے والوں نے علامہؒ سے اس بارے میں بڑی لے دے کی۔ علامہ نے صرف ایرانی شاعروں کو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے ان شاعروں کو بھی ہدف ملامت بنایا ہے جو بے عملی اور سست روی کی تعلیم دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ صوفیوں، فقیہوں اور شاعروں کے غلط اندازِ فکر نے نہ جانے کتنے سفینوں کو غرقاب کیا ہے۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکے کتنے
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

اقبالؒ "شعرورانِ ہند" کے عنوان سے ضرب کلیم میں فرماتے ہیں۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کا مزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار

تقدیر یزداں

اقبالؒ تقدیر یزداں کے تقدیر ازلی کے قائل نہیں ہیں ۔ وہ تقدیرِ یزداں ہونے کی اُمید انسان کے دل میں بساتے ہیں ۔ ان کی یہ اُمید اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی بناء پر ہے جو قرآنِ مجید کے پارہ ۱۳ سورۃ الرّعد میں اس طرح مذکور ہے ۔

یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ	اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو
وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ	چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور اسی کے
(الرّعد)	پاس اُمّ الکتاب ہے ۔

بناء بریں لیلۃ البرات کی مخصوص دُعا میں حضور سرورِ کائناتؐ فرماتے ہیں ۔

اَللّٰھُمَّ اِنْ کُنْتَ کَتَبْتَنِیْ فِیْ اُمِّ الْکِتَابِ عِنْدَکَ شَقِیًّا فَقِیْرًا فَامْحُ عَنِّیْ اِسْمَ الْاَشْقِیَاءِ وَثَبِّتْنِیْ عِنْدَکَ سَعِیْدًا وَغَنِیًّا وَاِنْ کُنْتَ کَتَبْتَنِیْ فِیْ اُمِّ الْکِتَابِ عِنْدَکَ مَحْرُوْمًا مُقْتِرًا عَلٰی رِزْقِیْ فَامْحُ عَنِّیْ حِرْمَانِیْ ۔ الخ

غرض یہ دُعا ایک مسلمان کو سب کچھ صرف تقدیرِ الٰہی پر چھوڑ کر اور ہاتھ پاؤں باندھ کر بیٹھنے کی اجازت قطعاً نہیں دیتی ہے بلکہ وہ خود

تقدیر یزدان ہونے کی تعلیم دیتی ہے۔ پس مسلمان کو چاہیئے کہ وہ محرومیت اور یاس کو کبھی اپنے دل میں جگہ نہ دیں۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی پستی کے اسباب یہی ہیں کہ وہ تقدیر کا غلط مفہوم سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھے ہوئے ہیں کہ جو کچھ ازل سے متعین ہے اسے انسان کسی طور بدل نہیں سکتا ہے۔ حالانکہ خود ربّ العالمین انسان کو اپنی تقدیر بدلنے کی تعلیم دیتا ہے اور اُسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے منع کرتا ہے۔ اس ضمن میں اِرشاد ربّانی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَا بِاَنْفُسِھِمْ یعنی اللہ تعالیٰ کسی جماعت یا قوم کی تقدیر کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ جماعت یا قوم خود اپنی حالت کو نہ بدل ڈالیں۔ اقبالؒ ایسے ہندوستانیوں سے بیزار ہے جو کہتے ہیں۔

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خودمختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

یعنی جو کچھ خُدا چاہے، کرے گا۔ عمل اور کوشش بے کار ہے۔ یہ انداز فکر علامہؒ کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ خیال خُدائی تعلیمات کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے گا۔ اس حقیقت کے برعکس کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انسان بے اختیار ہے لیکن اقبالؒ اس خیال کی تردید کرتے ہیں اور اس پر قطعاً یقین نہیں کرتے ہیں اُنکے یہاں نا اُمیدی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور وہ انسان کو خود اپنی تقدیر کا مالک مانتے ہیں۔

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں　　تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

اُنھوں نے صرف اسی خیال پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ وہ مردِ مؤمن کی نگاہِ کرم کو معمارِ تقدیر بتلاتے ہیں۔ اسی طرح وہ انسان کی تقدیر کے بدلنے کے قائل ہیں۔

ع　کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اس طاقتِ عظیم کا سرچشمہ اِن کے نزدیک قُرآن مجید ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے اندر وہ فلسفہ پُوشیدہ ہے جو قوموں کی سربلندی اور کمالِ عروج سے ہمکنار کرتا ہے۔ اقبالؒ قُرآن کی روشنی میں قوم کے سامنے ایک ایسا فلسفہ حیات پیش کرتے ہیں جو اُنکے نزدیک قوم کے تمام امراض کا واحد علاج ہے وہ اس فلسفہ کو "فلسفہ خودی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اقبالؒ کے تعلق سے میرے دل میں جذبات کا ایک گہرا سمندر ہے جسے صفحہ قرطاس پر لانا محال ہے۔ کیونکہ بسا اوقات الفاظ جذبات کا ساتھ دینے سے قاصر رہتے ہیں۔

جذبات اِک عالم اکبر ہے الفاظ کی دُنیا چھوٹی سی
اظہارِ تشکر کیونکر ہو، یہ جُرأت جُرأتِ بیجا ہے

دُرِّ ثمین

ایک مرتبہ حضرت بایزید بسطامیؒ نے کسی امام کے پیچھے نماز پڑھی۔ بعد نماز امام نے پوچھا کہ آپ کا کھانا پینا کہاں سے چلتا ہے آپ نے جواب دیا کہ ذرا صبر کرو۔ پہلے میں نماز کا اعادہ کرلوں۔ تب تمہاری بات کا جواب دوں کہ جو شخص روزی دینے والے کو نہ جانے، اس کے پیچھے نماز روا نہیں۔

(حضرت بایزید بسطامیؒ)

میں نے چار چیزوں کو دنیا میں ڈھونڈا اور نہ پایا۔ اوّل۔ عالم بے طمع۔ دوم، یار موافق۔ سوم، طاعت بے ریا، چہارم، لقمۂ حلال۔

(حضرت بایزید بسطامیؒ)

GHALIB ACADEMY
DELHI

قرآن حکیم سے شغف رکھ۔ یہی تمہارے لئے دلیل اور حجت ہے۔

(ابوالسید غلام محمد شاہ قادریؒ)

گلشن پبلیشرز سری نگر

تازہ ترین ادبی، تنقیدی اور تاریخی کتابیں

فہرست ۹۰-۱۹۸۹ء

۱- اردو طنز و مزاح- احتساب و انتخاب- ابن اسماعیل ۱۰۰/-
۲- دستِ قضا (قوم موسیٰ کی تاریخ) 〃 〃 ۵۰/-
۳- اردو کی ادبی تاریخ (جدید ایڈیشن) پروفیسر عبدالقادر سروری ۳۰/-
۴- اردو کے تصنیفی و تالیفی ادارے- ڈاکٹر دیوانند رگیا ۵۰/-
۵- رہنمائے معلمین اردو- 〃 〃 ۳۵/-
۶- تفسیر اقبال- بہار الہ آبادی ۷۵/-
۷- ولی عہد- ڈاکٹر کرن سنگھ ۶۰/-
۸- خلاصۃ التواریخ- مرزا کمال الدین شیدا ۹۰/-
۹- ارمغان شیدا 〃 〃 ۳۵/-
۱۰- شباب کشمیر (تاریخ زین العابدین) محمد الدین فوق ۴۰/-
۱۱- تواریخ اقوام کشمیر- 〃 〃 ۴۵/-
۱۲- مختصر تاریخ کشمیر- محمد امین پنڈت ۲۵/-
۱۳- جموں و کشمیر کے گوجر- آر- آر- کھجوریہ ۳۰/-
۱۴- کشمیر اور ڈوگرہ راج- ملک فضل حسین ۴۵/-
۱۵- للہ دید (اردو) جیا لال گیرو ۴۰/-
۱۶- اردو کشمیری بول چال- مفتی محمد مقبول ۱۵/-
۱۷- ایک چہرہ پرچھائیوں کا (ڈرامہ) ڈاکٹر شکیل الرحمٰن ۱۵/-
۱۸- اقبال اور فنون لطیفہ 〃 〃 ۱۵/-
۱۹- تلاش (ناول) محی الدین مجبور ۷/-
۲۰- کیڑے- افسانوں کا مجموعہ ابن اسماعیل ۲۵/-
۲۱- دردِ جگر- محمد شفیع محجوب ۴/-
۲۲- آدمی نامہ- نظیر اکبر آبادی ۳/-
۲۳- نفسیات اور تعلیمی مسائل- عبدالاحد شاہ ۲۰/-
۲۴- نظم و نسق مدرسہ اصولِ تعلیم- 〃 〃 ۲۰/-
۲۵- خدا کی ہستی- مولانا ابوالکلام آزاد ۱۳/-
۲۶- صدائے حق- 〃 〃 ۷/-
۲۷- مضامین البلاغ- 〃 〃 ۲۰/-
۲۸- عیدین- 〃 〃 ۷/-
۲۹- حضرت یوسف علیہ السلام- 〃 ۱۰/-
۳۰- تحریک نظم جماعت- 〃 ۳۰/-
۳۱- قرآن کا قانون عروج و زوال 〃 ۱۵/-
۳۲- شہادت حسینؓ 〃 ۷/-
۳۳- البیرونی اور جغرافیہ عالم 〃 ۱۴/-
۳۴- فریضۂ حج 〃 ۸/-
۳۵- خطباتِ حسینؓ- منظور ہاشمی ۱۰/-
۳۶- اوصافِ اقبال- بہار الہ آبادی ۵۰/-
۳۷- سرقہ اور توارد- نریش کمار شاد ۶/-
۳۸- میر سید علی ہمدانی (سوانح) ڈاکٹر طیبہ اشرف ۳۵/-
۳۹- میر ضمیر- اکبر حیدری ۸/-
۴۰- خوشگوار رفاقت- میری ایلمن جیز ۷/-
۴۱- فن انشا پردازی- سید محی الدین قادری ۴/-
۴۲- تمہید ادب- برائے طلبا- ۸/-
۴۳- بوسٹن کا سفر- محمود ہاشمی ۱۰/۵۰

گلشن پبلیشرز- گاؤکدل چوک- ایکس چینج روڈ سرینگر کشمیر ۱۹۰۰۰۱
ٹیلی فون نمبر: ۷۲۰۸۱ (72081)